ماهنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

OCTOBER 1986

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد نمبر ۱ ——— شمارہ نمبر ۳

اکتوبر ۱۹۸۶ء

○ مدیر منتظم ——— نور محمد فلاحی

○ مدیر ——— طارق فارقلیط فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

• سالانہ زر تعاون	۳۰/	روپے
• خصوصی تعاون	۱۰۰/	روپے
• لائف ممبر شپ	۵۰۰/	روپے
• غیر ممالک سے	۱۵/	امریکی ڈالر
• فی شمارہ	۳/	روپے

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ مجلہ حیاتِ نو۔ جامعۃ الفلاح۔ بلریا گنج اعظم گڈھ یو۔پی ۲۷۶۱۲۱

کاتب عبدالرحیم اعظمی

نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ فیض آباد

نقوش حیات نو

اداریہ

ہم کہاں کھڑے ہیں؟	ایڈیٹر	۳

مقالات

نظم قرآن اور علمائے ہند	عبید اللہ فہد فلاحی	۷
اقبال کی شاعری میں مرد مومن کا تصور	سید لطیف حسین کاظمی	۲۰
قدیم چینی تہذیب کا مطالعہ	محمد مسعود عالم قاسمی	۳۷

پاس پڑوس

آنسہ بے نظیر اور پاکستان	طارق نادر قلیط	۴۱
افغان مہاجر کیمپ	سید اسعد گیلانی	۴۷

شعر و نغمہ

عالم اسلام کا جواب	نعیم صدیقی	۳۲

تعارف و تبصرہ

افغان مجاہدین، ایران کی [illegible]، بابری مسجد نمبر	ادارہ	۶۲

حلقۂ یاراں

	عبدالرحمان خالد رضی الدین	۵۶

اداریہ

ہم کہاں کھڑے ہیں

"ہمارا ملک بھارت جو مذہبی رواداری میں اپنی مثال آپ اور جو رشیوں منیوں کا مسکن تھا جس نے دنیا کو امن، شانتی اور رواداری کا پیغام دیا اب ہنسا، قتل و خونریزی میں اپنی مثال آپ ہو گیا ہے اور دن بدن یہ سلسلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔"

عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ انگریزوں نے اپنے اقتدار کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے ہندوستان میں جو پالیسی اپنائی وہ انتہائی خطرناک تھی۔ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول پر ایک ہی ملک کے دو بھائیوں کو آمنے سامنے کھڑا کر دیا اور نہیں پر وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے اور ان کے درمیان دشمنی کا بیج بوتے رہے۔ ایک قوم کی تاریخ کو توڑ مروڑ کر اسے غلط اور گھناؤنے طریقے پر پیش کیا کہ دوسری قوم کو اس سے نفرت ہو گئی اور وہ آج تک لڑتے جا رہے ہیں۔ لیکن کیا اب بھی یہ بات صحیح ہے؟ کیا آزادی کے چالیس سال بعد بھی ہم انگریزوں کی اسی پالیسی کا شکار ہیں یا کچھ اور اسباب بھی ہیں؟ ہندوستان کے موجودہ حالات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو بظاہر ایسا نظر نہیں آتا۔ پنجاب کا خلفشار اور ہزاروں جانوں کی تباہی، ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو ملک کی سب سے زیادہ با اختیار شخصیت اندرا گاندھی کا قتل، ۲۵ جولائی کو [illegible] کا پیش آنے والا حادثہ خونریز واقعہ، اور اگست ۱۹۸۶ء کو دوسرا کا دوسرے وزرا کے قتل کا واقعہ یقیناً کچھ اور اسباب کی نشاندہی کرتے ہیں۔

فروری ۱۹۸۶ء میں اجودھیا کی بابری مسجد پر عدالت کے فیصلے کی آڑ میں منصوبہ بند سازش کے ذریعہ قبضہ، ۳۰ اپریل ۱۹۸۶ء کو بمبئی میں نہتے مسلمانوں پر پولیس کی اندھا دھند فائرنگ اور تشدد، ۱۰ جون ۱۹۸۶ء کو الٰہ آباد میں زبردست فساد، ۲ آدمی ہلاک، پی اے سی کا ظلم و ستم، ہزاروں گرفتار، لاکھوں کی جائداد کی بربادی، ۵ سے ۱۶ جولائی تک احمد آباد (گجرات) میں فرقہ وارانہ فساد، ۶۰ سے زائد افراد کی ہلاکت، لاکھوں کی جائداد کی بربادی، ۲۸ اور ۲۹ جولائی ضلع بستی کے گرنیا گاؤں میں بے قصور افراد کی پولیس کے ہاتھوں ہلاکت، ۸ جولائی کو بہار کے ایک گاؤں کنسارا میں شیخ ذبیحہ، ان کی طرف سے ۱۱ بے قصور غریبوں کا نہایت بے دردی سے ہلاک کیا جانا، ۹ اپریل بہار ہی کے ایک گاؤں اروال میں عوام کے ایک جلسہ

پولیس کا گولیاں برسا کر ۲۱ افراد کو ہلاک کر دینا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہنسا، قتل و خونریزی ہمارے ایک ایک فرد، قوم، گروہ، امیر و غریب ہر ایک کے اندر سرایت کر گئی ہے اور یہ بڑھتی جاری ہے۔ اس کے علاوہ کشمیر، آسام، میزورم، بنگال، مہاراشٹر، کرناٹک اور تمل ناڈو میں انتشار و کشمکش اور بے چینی نے ہندوستان کو ٹوٹ پھوٹ کے گڑھے پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کی جڑیں کہاں ہیں؟ اور کون اس کے پیچھے ہے؟

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ انگریز تو اب چلے گئے اور ہمارا ملک آزاد ہو گیا مگر ہمارے ملک میں غیر ملکی طاقتیں زیادہ سرگرم ہو گئیں، اور خفیہ ایجنسیوں کے ذریعہ یہ توڑ پھوڑ اور ہنگامہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہندوستان جب کسی بین الاقوامی یا غیر ملکی مسئلہ میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے اور کسی طرح کا بیان دیتا ہے جس سے سپر پاور زد پڑتی ہے تو توڑ پھوڑ اور ہنسا بڑھ جاتی ہے اس طرح ہندوستان کے اوپر دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے اسباب کچھ اور ہیں اور وہ تین ہیں۔ معاشی، سیاسی، اور تہذیبی۔

آزادی سے پہلے کے ہندوستان اور موجودہ ہندوستان میں فرق نمایاں ہیں۔ اس درمیان ہم نے صنعت و حرفت اور زراعت کے شعبے میں کافی ترقی کی ہے مگر غلط پالیسیوں کی وجہ سے اس کا فائدہ ہر شہری کو حاصل نہیں ہو سکا ہے، نتیجۃً غریب اور امیر کے درمیان اور دوری پیدا ہوئی ہے۔ غریب اور غریب ہوا ہے اور امیر اور امیر ہوئے۔ آج بھی ہندوستان کی ۴۰ کروڑ آبادی غریبی لائن سے نیچے زندگی گزار رہی ہے اور ہزاروں لاکھوں نوجوان بے کار اور بے روزگار پڑے ہوئے ہیں۔

دیہی علاقوں میں بیروزگاری اور عام زندگی کی سہولتیں دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے عوام شہروں کا رُخ کر رہے ہیں، شہروں کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے، اور اس طرح لا اینڈ آرڈر کے نت نئے مسائل جنم لے رہے ہیں۔

شہروں میں صنعتوں اور کل کارخانوں کے ارتکاز کی وجہ سے بھی دیہات سے لوگ کمانے اور پیٹ پالنے کے لئے بے تحاشہ بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ رہن سہن، صفائی اور کھانے پینے کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں، مزدوروں اور مل مالکوں میں اجرت کے سوال پر آئے دن ٹکراؤ ہوتی ہے، اور پھر کشمکش شروع ہو جاتی ہے اس طرح ماحول زہر آلود ہوتا جا رہا ہے۔ اور اغوا، قتل، چوری، لوٹ مار کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔

دوسری وجہ سیاسی ہے۔ ان لیڈروں، سیاست دانوں کو چھوڑ کر جنہوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا بدقسمتی سے ہمارے ملک کو سنجیدہ، مخلص اور ملک کے سچے خیر خواہ لیڈر اور سیاست داں میسر نہ آسکے برسات کے مینڈکوں کی طرح سے نت نئی پارٹیاں بنتی چلی گئیں، اور چونکہ زندگی کی تمام آسائشیں اور سہولتیں لیڈروں، سیاست دانوں کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ عمدہ طریقے سے دستیاب تھیں اور بڑی حد تک یہ لا اینڈ آرڈر سے بھی محفوظ تھے اس لئے جرائم پیشہ افراد نے اس کوچہ کا رُخ کیا اور دیکھتے دیکھتے [illegible] کا اصول عملاً کارفرما ہو گیا، اور دھونس، دھاندلی، قتل، خونریزی، اغوا، لوٹ، مار، دھاڑ، دھمکا کر اکثریت حاصل کرنے اور کرسی اور اقتدار تک پہنچنے کی کوشش کی جانے لگی۔ ہر سیاسی لیڈر کے پاس گنڈوں کی ایک ٹیم ہوتی تھی جو بوقت ضرورت کام آتی تھی، اور سیاست داں ان کے کام آتے تھے، بیکار اور بے روزگار نوجوانوں کی ایک فوج ہر سیاست داں کے پیچھے جمع ہو گئی جس نے اپنی غنڈہ گردی کا دائرہ کسی اور طریقے سے کرنا شروع کر دیا۔ یہ سیاست داں اور لیڈر لا اینڈ آرڈر کی خلاف ورزی میں مدد اور حفاظت کرنے لگے، اور چوروں، ڈاکوؤں اور گنڈوں کی پناہ گاہ بن گئے۔ نتیجۃً لا اینڈ آرڈر کی پوری خلاف ورزی کر دی اور بگاڑ ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ ان سیاست دانوں نے اپنی اکثریت برقرار رکھنے کے لئے علاقہ، زبان، مذہب، ذات پات کو بنیاد بنایا اور ایک خونریز ماحول پیدا کر دیا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے جس سے ہم اور آپ دوچار ہیں۔

تیسری وجہ تہذیبی ہے۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف قومیں رہتی ہیں، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بودھ، جین وغیرہ۔ ان کی اپنی تہذیب ہے، اپنا تمدن ہے، رسم و رواج ہے، عقیدہ ہے، پرسنل لا ہے، مذہب ہے، اور وہ اپنا تشخص برقرار رکھنا چاہتی ہیں لیکن بدقسمتی سے اکثریت کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ جمہوریت کا مطلب ہوتا ہے اکثریتی طبقہ کا ملک، اس کی تہذیب، اس کا تمدن، اس کا اقتدار، اب جو بھی اقلیت میں ہے، ان کو اکثریت کی تمام چیزوں کو اختیار کرنا چاہئے اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو گویا وہ فرقہ واریت پھیلا رہی ہیں۔ اقلیتوں کے ذہن و دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے اور ایسا اکثریتی طبقہ کے بعض جارحانہ اقدامات کی وجہ سے ہوا ہے، کہ وہ ان کی تہذیب و تمدن کو ختم اور ان کے تشخص کو ختم کرنا چاہتی ہیں چنانچہ جارحیت کے جواب میں اپنی بقا کے لئے جد و جہد کا احساس شدید ہوتا جا رہا ہے، اور یہ ہنسا اور فرقہ وارانہ فساد نیز یوپی اور پنجاب کے انتشار کی بنیادی وجہ ہے۔

دستور کے رہنما اصولوں کی دفعہ ۴۴ جس میں صاف واضح الفاظ میں اس بات کی سفارش کی گئی ہے

کہ تمام ملک کے باشندوں کے لئے یکساں سول کوڈ بنایا جائے، اسی جارحیت کی طرف اشارہ کرتی ہے
بدقسمتی سے حکمراں طبقہ کی سوچ کی لائن بھی یہی ہے۔ چنانچہ مرکزی وزیر قانون اشوک سین کے بیان کے مطابق
اختیاری یکساں سول کوڈ کا مسودہ پارلیمنٹ کے اگلے اجلاس میں پیش کر دیا جائے گا۔

کہنے کو تو یہ اختیاری ہوگا مگر اب ملک کے اکثریتی رویہ کے پیش نظر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ اختیاری آزادی کتنے دنوں کے لئے ہوگی، یہ تو صرف دکھانے کے لئے ہے، کچھ کے بعد جو ہندو لیڈروں سے یہ مطالبہ کرایا جائے گا کہ لفظ اختیاری کو ہٹا کر لازمی کیا جائے، اور پھر یہ لازمی یکساں سول کوڈ بن جائے گا۔ خدا کرے ایسا ہو، لیکن اگر ایسا ہو گیا تو کم از کم مسلمانوں کو ہندوستان میں فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ کیا کریں۔ اکثریت میں ضم ہو جائیں یا اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرکے اس سرزمین ہند کو سیراب کر دیں۔ مسلمان اور ہندوستان تاریخ کے ایک اہم موڑ پر کھڑے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ تاریخ موڑ جائے اور ہم تماشائی بنے دیکھتے رہیں۔ مسلم پرسنل لا بورڈ اور اکابرین ملت کو ادھر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ہمارا فرقہ وارانہ قتل خونریزی کو ختم کرنا مشکل تو ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے بشرطیکہ حکومت معاشی پالیسیوں کو اس طرح ترتیب دے کہ اس سے ہر طبقہ کو فائدہ پہنچے اور دولت صرف دولتمندوں ہی کی جھولی میں نہ جائے بلکہ غریب، مزدور اور پچھڑی ذات کے لوگ بھی استفادہ کر سکیں۔

سیاسی پارٹیاں اپنے رویے کو تبدیل کریں شریف مخلص، دیانتدار اور ملک کے بہی خواہ شخص کو ٹکٹ دیں اور عوام ایسے ہی فرد کو منتخب کریں۔ جرائم پیشہ خود غرض اور حریص آدمی کو منتخب نہ کریں۔

اکثریت اقلیت کے تئیں اپنے رویہ پر نظر ثانی کرے، ان کو ان کے حقوق دے اور جیو اور جینے دو کے اصول پر اپنے مذہب اور تہذیب کی توسیع و اشاعت کے لئے پر امن جمہوری راستہ کا انتخاب کرے، جارحیت اور قانون اور اقتدار کے ذریعہ کسی اقلیت کے تشخص پر شب خون نہ مارے۔ اگر ایسا ہوا تو ایک امن و شانتی کا ماحول پیدا ہوگا اور ہر فرد ترقی کرے گا ورنہ ہم تاریخ کے ایسے موڑ کے قریب پہنچ چکے ہیں جہاں اس ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا اے کاش کہ ایسا نہ ہو۔

طارق انور حلیم فلاحی
۱۲/ ۹/ ۱۹۹۲

عبداللہ فہد فلاحی ایم اے، شعبہ سیاسیات
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نظم قرآن اور علمائے ہند

قرآن پاک ایک منظم و مربوط کلام ہے اور اس کی موجودہ ترتیب میں ایک نہایت ہی وسیع اور حکیمانہ مناسبت پائی جاتی ہے۔ یہ نظم اور مناسبت نہ صرف آیات کے اندر موجود ہے بلکہ ہر آیت اپنے ماقبل و مابعد کی آیت سے ہر رکوع اپنے پہلے اور بعد کے رکوع سے، ہر سورہ اپنے ماقبل اور بعد کی سورہ سے اور ہر گروپ اپنے ماقبل اور بعد کے گروپ سے اس طرح جڑا ہوا ہے کہ یہ منظم و مربوط کلام قیامت تک کے لئے معجزہ بن گیا ہے۔ اگر قرآن پاک میں کوئی نظم و ترتیب نہ ہوتی تو جس ترتیب سے قرآنی آیات نازل ہوئی تھیں اسی ترتیب سے مصحف میں جمع کر دی جاتیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز سے ہی علماء کا ایک گروہ ایسا رہا ہے جو نظم کا بڑی شدت سے قائل رہا ہے۔ ان میں ابو بکر نیشاپوری (م ۳۲۴ھ) امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ)، امام ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ)، قاضی ابو بکر بن عربی (م ۵۴۳ھ)، علامہ ابو جعفر بن زبیر، شیخ ابو حیان (م ۷۴۵ھ)، شیخ برہان الدین بقاعی (م ۸۸۵ھ) وغیرہ جبال علم و فن سر فہرست ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ قرآن کے اس عمیق اور گہرے علم پر بہت کم کام ان بزرگوں نے انجام دیا اور کوئی خاص تفسیر بھی نہیں لکھی گئی جسے اہل علم کے حلقہ میں حسن قبول حاصل ہو۔ یہ سہرا ہندوستان کے سر جاتا ہے جس نے سب سے پہلے علم نظام القرآن کے میدان میں نویں صدی کے آغاز میں ایک بہت شہکار پیش کیا۔[1] علامہ شیخ علاء الدین علی بن احمد مہائمی (م ۸۳۵ھ) وہ پہلے ہندوستانی بلکہ عالم اسلام کے مفسر ہیں جنھوں نے اپنی تفسیر "تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان" میں ربط آیات اور مناسبت کے علم کو نظم وجود کا پیرہن عطا کیا۔ اس تفسیر کی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا "تفسیر رحمانی کہ بہ صنعت ربط و تدقیق موصوف است و تفسیر را بہ قرآن امتزاج دادہ است"۔ علامہ مناظر احسن گیلانی نے اس تفسیر کو علم نظام کی دنیا میں ایک منفرد کارنامہ قرار دیا ہے، خود علامہ مہائمی تفسیر کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں کہ "یہ نکات نظم قرآنی کا بہترین مجموعہ ہے جن میں سے اکثر مجھ سے پہلے کسی کے ذہن میں نہ آئے تھے، میں کہ [illegible] کہاں اس لائق تھا کہ ان تک پہنچ سکتا، جنھیں

صرف پاک قرآن پڑھ سکتے ہیں لیکن اللہ پاک نے محض اپنے فضل سے میرے لیے اس علم کو آسان فرمادیا ہے۔

علامہ مہائمی سورہ بقرہ میں جہاں سے سود کا بیان شروع ہوتا ہے، ان آیات کا تعلق ماقبل سے یوں بیان فرماتے ہیں: "اس سے قبل کی آیت میں ان لوگوں کا بیان ہے جو خفیہ و علانیہ اللہ کی راہ میں انفاق کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ انھیں انفاق سے کوئی خوف و حزن نہیں ہوتا کیونکہ راہ خدا میں اتنا پیسہ خرچ ہوا۔ اس کے برعکس اگلے سودی کاروبار کرنے والوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ سے انھیں تکلیف ہوتی ہے اور یہ لوگ ہمیشہ خوف و حزن میں مبتلا رہتے ہیں کیونکہ جو پیسہ انھوں نے خرچ کیا ہے، ان کا کمایا ہوا نہیں تھا بلکہ سودی کاروبار کے ذریعہ بلا محنت دوسروں کی کمائی چوس کر انھیں دولت ملی تھی، اس لیے اس انفاق کے سود مند ہونے کے سلسلہ میں انھیں خطرہ لاحق رہتا ہے، کہ قیامت میں وہ کام آئے گا یا نہیں آئے گا"۔ اس طرح علامہ مہائمی نے یہاں سود خوروں کی ذہنی کیفیت ان کی غیر یقینی صورت حال، ان کا اپنے اعمال پر عدم اعتماد اور آخرت کے دن ان کا کھٹکا وغیرہ پر گفتگو کی ہے اور اہل ایمان کو، اس تذبذب سے دور، بچنے کی بشارت سنا کر گویا دونوں طرح کی آیات میں ربط پیدا کیا ہے۔ وہ دونوں آیات یہ ہیں:

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا ......
فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (بقرہ: ۲۷۴، ۲۷۵)

لیکن جو لوگ قرآن کے ادبی رنگ و ڈھنگ سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن اکثر کسی چیز کے دونوں پہلوؤں کا ذکر کرتا ہے، جہاں جنتیوں کو وہ حور و غلمان کی بشارت سناتا ہے وہیں جہنمیوں کو آگ کی دھمکی بھی دیتا ہے۔ جہاں وہ بخل کی مذمت کرتا ہے وہیں انفاق اور سخاوت کی تعریف کرتا ہے کلمہ طیبہ کے ساتھ کلمہ خبیثہ کا بیان، اہل ایمان کے ساتھ اہل کفر کا ذکر، ظلم کے ساتھ عدل اور سود کے ساتھ صدقہ اور احسان کا تذکرہ قرآن مجید کے تقابلی اسلوب کا تقاضہ ہے۔ اس طرح گویا یہاں قرآن اس امر کی نشاندہی کرنا چاہتا ہے کہ سود خور انسان کے اندر بیک وقت تنگ دلی اور خود غرضی پروان چڑھتی ہے اور انفاق کشادہ دلی، عالی حوصلگی اور ایثار و قربانی کے بلند جذبات کو فروغ دیتا ہے۔ قرآن میں دوسرے مقامات پر جہاں جہاں سود کا ذکر ہے وہاں انفاق اور صدقہ کا ذکر بھی ضرور ہوا ہے مثلاً

سورہ آل عمران میں ۹۲ سے آیت ۱۲۹ تک مثبت و منفی پہلوؤں سے انفاق پر ابھارنے کے بعد آیت ۱۳۰ سے سود کا بیان شروع ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ علامہ مہائمی نے جو ربط آیات کی کوشش کی ہے وہ قرآن کی بلاغت کو سمجھنے میں بہت زیادہ معاون نہیں ہے۔

علامہ مہائمی کے بعد اس فہرست میں دوسرا نام شیخ مبارک بن خضر ناگوری (م ۱۰۰۱ھ) کا آتا ہے۔ جن کی تصنیف منبع عیون المعانی و مطلع شموس المثانی پانچ ضخیم جلدوں میں قرآن پاک کی تفسیر ہے۔ علامہ ناگوری نے وجوہ نظم قرآن، قراءات عشرہ، انواع وقوف و فواصل آیات، علما اور صاحب کشف عارفین کے معانی و مطالب، جملوں کے ربط اور آیتوں اور سورتوں کے درمیان مناسبت، انبیاء علیہم السلام کے قصص، اقوام و ملل کے واقعات، اسباب نزول اور ناسخ و منسوخ وغیرہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔ علامہ ناگوری کسی سورۃ کو شروع کرنے کے بعد جب اس کا مضمون بیان کرتے ہیں تو اس کا نظم اور وجہ نظم بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ سورہ والضحیٰ کا سورہ واللیل سے ربط بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سورہ واللیل میں حضرت ابوبکرؓ کی مدح ہے اور سورہ والضحیٰ میں رسول اللہ کی نعت ہے۔ گویا ایک سورہ مدحیہ ہے اور دوسری سورہ نعتیہ، اور مدح و نعت میں ربط بالکل واضح ہے۔ علامہ ناگوری کی اس دلچسپ نکتہ آفرینی پر کسی قسم کا تبصرہ کرنا ہمارے دائرہ علم سے باہر ہے۔ لیکن قرآن کا ایک طالب علم ان دونوں سورتوں پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ ان دونوں سورتوں کا مرکزی مضمون انفاق، صدقہ اور بنی نوع انسان کے ساتھ بھلائی ہے۔ سورہ واللیل میں جود و سخاوت پر ابھارا گیا ہے۔ اور بخل کی مذمت کی گئی ہے اور سورہ والضحیٰ میں غریبوں کے ساتھ رحمت و شفقت اور یتیموں کے ساتھ مہربانی و دلجوئی کی تعلیم دینے کے ساتھ نہایت لطیف انداز میں خدا سے تعلق استوار کرنے کی تلقین بھی کی گئی ہے۔ اس طرح گویا پہلی سورہ میں تمام تر زور انفاق پر ہے جبکہ دوسری سورہ میں انفاق کے ساتھ تعلق باللہ پر زور دیا گیا ہے اور یہی دونوں چیزیں یعنی انسانوں کے حقوق کی ادائیگی اور خدا سے تعلق ہی پورے دین کی اساس ہے۔ ایک طرف انسان خدا کا اطاعت گزار اور فرمانبردار ہو اور دوسری طرف اپنے ابنائے جنس کے ساتھ عدل و انصاف اور محبت و اخوت کا رشتہ قائم رکھے۔ اس طرح ان دونوں سورتوں کے ذریعہ گویا پوری قرآنی تعلیم بیان کر دی گئی ہے۔

اس سلسلہ کی ایک اہم کوشش شیخ سعد بن عبدالحمید لاہوری (م [illegible]ھ) کی ہے۔ شیخ کو ان کی ذہنی و علمی صلاحیتوں کی وجہ سے اکبر کے زمانہ میں مالوہ کا منصب صدارت عطا کیا گیا لیکن جلد ہی اکبر بادشاہ

ہوگیا اور گوالیار کے قلعہ میں آپ نظربند کر دیے گئے۔ جیل کے پانچ سالہ مدت قیام میں آپ نے الدر النظیم فی ترتیب الآی والسور (القرآن الکریم) تصنیف فرمائی جو ربط و نظام کے میدان میں ایک قابل قدر کوشش ہے۔ علامہ لاہوری نے اس کتاب میں قرآنی آیتوں اور سورتوں کے اندر نظم و مناسبت کو بیان کیا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ قیمتی کتاب دستیاب نہیں ہے۔ علامہ عبدالحی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر میں چند سطروں میں اس کا تذکرہ کر دیا ہے[۵]۔

ربط و نظام کے سلسلہ میں ہندوستان میں بیسویں صدی نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ پوری تفسیری تاریخ میں ممتاز اور منفرد ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے علوم اسلامیہ کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کا تذکرہ کرنے کے لئے پوری ایک کتاب درکار ہے لیکن آپ کی قرآنی خدمات بھی نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ مناسبت و نظام پر آپ نے باقاعدہ ایک رسالہ تصنیف فرمایا "سبق الغایات فی نسق الآیات" پر تفصیلی گفتگو فرمائی پھر اپنی تفسیر بیان القرآن میں ان اصولوں کو عملاً ملحوظ رکھا۔ یہاں بہتر ہوگا کہ وضاحت کے لئے دو ایک مثالیں بیان کی جائیں۔

سورہ بقرہ میں آیت حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ کا نظم ماقبل سے واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "چونکہ اس سے آگے پیچھے طلاق وغیرہ کے احکام ہیں، درمیان میں نماز کے احکام بیان فرمانا اشارہ اس طرف ہے کہ مقصود اصلی توجہ الی اللہ ہے اور معاشرات و معاملات کے احکام کے علاوہ ان مصلحتوں کے اس توجہ کی ترقی اور حفاظت بھی مقصود ہے۔ چنانچہ جب ان کو خدائی احکام سمجھکر عمل کیا جاوے گا تو جلا ہوگی پھر یہ کہ ان احکام میں ادائے حقوق عباد بھی ہے اور حقوق عباد کے اتلاف سے درگاہ الٰہی سے دوری ہوتی ہے جس کے لوازم میں سے حق و عبد دونوں کی طرف سے بے توجہی ہے۔ چونکہ نماز میں یہ توجہ زیادہ ظاہر ہے اس لئے اس کے درمیان میں لانے سے اس توجہ کے مقصود ہونے پر زیادہ دلالت ہوگی کہ عبد اس توجہ کو ہر وقت پیش نظر رکھے" گویا مولانا تھانوی کے نزدیک یہ نظم دو باتوں کی وجہ سے ظاہر ہے۔ ایک وجہ نظم یہ ہے کہ طلاق وغیرہ احکام و معاملات میں اصل چیز توجہ الی اللہ ہے اور نماز تو سراپا تعلق و توجہ الی اللہ ہے۔ دوسری وجہ یہ بتائی کہ یہ سارے احکام و معاملات حقوق العباد سے متعلق ہیں اور نماز حقوق اللہ سے متعلق ہے۔ جو لوگ حقوق عباد کا اتلاف کرتے ہیں وہ حقوق اللہ کا بھی ضیاع کرتے ہیں، اس طرح جو لوگ حقوق الٰہی کا خیال نہیں رکھتے وہ حقوق

عباد کی ادائیگی میں بھی مخلص نہیں ہو سکتے۔

واضح رہے کہ یہ آیت نظم و مناسبت کے لحاظ سے قرآن کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے۔ مصر کے نامور ادیب سید قطب شہید اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں جب اس مقام پر پہنچے تو انھیں سے ربط جوڑنے میں ناکام رہے، اور کھل کر اپنی کم مائیگی کا اعتراف کیا ہے[۶] فرمایا "مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ اس مقام پر پہنچنے کے بعد چھ مہینے تک غور کرتا رہا کہ آیت صلوٰۃ طلاق کی آیات کے درمیان کیسے آگئی؟ مجھے توقع تھی کہ اس وقفہ میں اللہ تعالیٰ مجھ پر حقیقت کھول دے گا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ قارئین میں سے کوئی صاحب اگر وضاحت کریں گے تو شکرگزار رہوں گا۔" لیکن ایک طالب قرآن جب قرآن کے اسلوب بیان کا مطالعہ کرتا ہے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن جہاں کہیں احکام و شرائع کا تذکرہ کرتا ہے اس کا آغاز عموماً توحید یا نماز سے کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دین میں اصل حیثیت انھی دونوں چیزوں کو حاصل ہے، دوسری تمام عبادتیں اور طاعتیں فرع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حدیث نبوی ہے کہ الصلوٰۃ عماد الدین فمن اقامھا اقام الدین ومن ھدمھا ھدم الدین۔ پھر یہ بات بھی قرآن کے ایک طالب علم کو نظر آتی ہے کہ اختتام پر بھی عموماً اسی نماز یا توحید کا تذکرہ ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ سے آیت ۳۹ تک کا مطالعہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ سلسلۂ کلام توحید کے ذکر سے شروع ہوا ہے اور دوسرے احکام بیان کرنے کے بعد توحید ہی پر ختم ہو گیا ہے۔ اسی طرح سورہ المومنون کے آغاز میں بھی یہی اسلوب ہے۔ فلاح پانے والے مومنوں کے اعمال کا تذکرہ خشوع فی الصلوٰۃ سے شروع ہوا اور نماز کی پابندی اور حفاظت و محافظت پر انھیں ختم کیا گیا۔ گویا نماز منبع خیرات بھی ہے اور محافظ خیرات بھی۔ نیکیوں کی ابتدا بھی اسی سے ہوتی ہے اور نیکیوں کی حفاظت بھی اسی سے ہوتی ہے۔ پیش نظر مقام پر بھی یہی اسلوب کارفرما ہے۔ یہ آیت اسی سلسلہ کلام سے وابستہ ہے جو استعینوا بالصبر والصلوٰۃ یعنی نماز سے شروع ہوا تھا اور بہت سے احکام بیان کرنے کے بعد نماز کے تذکرہ پر اس سلسلہ کو مکمل کر دیا[۷]۔

نظم قرآن کی جو بنیاد ہمارے پیش رو اسلاف ڈالتے نظر آ رہے ہیں وہ ایک فن کی حیثیت اختیار کر کے ذروۂ آفتاب اس وقت بن جاتا ہے جب علامہ حمیدالدین فراہی (م ۱۳۴۹ھ) کی تصنیف دلائل النظام سامنے آتی ہے۔ علامہ موصوف نے صرف آیتوں کے اندر ربط و تناسب کو اجاگر نہیں کیا ہے بلکہ سورۃ

کو شروع سے آخر تک ایک حسین قالب میں ڈھال دیا ہے۔ آپ نے دلائل النظام میں نظم کی اہمیت و افادیت، اصول و مبادی اور بنیادی نقوش ہی سے بحث نہیں کی ہے بلکہ قرآن کی بہت سی سورتوں کی تفسیر کرکے طلبائے قرآن کیلئے عملی مثالیں بھی غور و فکر کے لئے فراہم کردی ہیں۔

مولانا نے مناسبت اور نظام میں جو فرق بتایا ہے وہ یہ ہے کہ تناسب علم نظام کا ایک جزو ہے۔ سورہ میں تناسب اگر معلوم بھی ہو جائے تو اس سے پورے کلام پر وہ روشنی نہیں پڑتی جو اسے معنوی وحدت کے رشتہ میں پرو کر اس کو ایک مستقل کلام کی حیثیت دے سکے۔ تناسب کا طالب عموماً اس مناسبت کی کھوج لگانے کی زحمت نہیں اٹھاتا بلکہ مجرد مناسبت پر خواہ وہ کسی قسم کی ہو قناعت کر لیتا ہے۔ دوسرے اس رشتہ کو ہاتھ سے چھوڑ دینے کا اکثر یہ نتیجہ بھی ہوتا ہے کہ ہر آیت میں کھینچ تان کر ایک مناسبت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کوئی نہ کوئی مناسبت قائم بھی کر دیتا ہے حالانکہ سرے سے ان متجاور آیات میں کوئی تعلق ہوتا ہی نہیں بلکہ نظم کلام کے مطابق پاس والی آیت اس آیت سے متصل ہوتی ہے جو اس کی قبل والی آیت سے بہت دور ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ امت کے بعض ذہین علماء اس طرح کی آیتوں میں جب کوئی معقول اور مناسب تناسب نہ پا سکے تو انھوں نے تناسب ہی کا انکار کر دیا۔ .... خلاصہ یہ ہے کہ علم نظام سے ہماری مراد یہ ہے کہ سورہ کی تاویل اس طرح کی جائے کہ پوری سورہ ایک کلام کے قالب میں ڈھل جائے اور وہ سورہ اپنی سابق و لاحق سورتوں سے جو باعتبار نظم اس سے دو پہلے یا پیچھے واقع ہوں مربوط ہو جائے جس طرح بعض آیتیں بطور جملہ معترضہ کے آجاتی ہیں اس طرح بعض سورتیں بھی بیچ میں بطور جملہ معترضہ کے آتی ہیں۔ اس نکتہ کو نگاہ میں رکھ کر غور کرو تو سارا قرآن ایک کلام کی منظم شکل میں نظر آئے گا، اور شروع سے آخر تک اس کے تمام اجزا میں نہایت ہی محکم و مضبوط مناسبت و ترتیب معلوم ہوگی۔ اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ علم نظام، اجزاء کی ترتیب و مناسبت کے علم کے علاوہ ایک اور علم ہے جو اس سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔"

ایک دوسرے مقام پر جہاں مولانا نے نظم کے ضروری اجزا کا ذکر کیا ہے نظام پر ان لفظوں میں روشنی ڈالی ہے[۲۱]: "نظام سے ہماری مراد یہ ہے کہ سورتوں کے معانی کی تصویر اس طرح اپنی اصلی صورتوں کے قالب میں ڈھل جائے کہ ہر سورہ کی ایک متعین و مشخص شکل بن جائے۔ پس اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر سورہ کے تمام معانی باہم دگر ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوں، اور ان سب کا ہدف کوئی ایک ہی موضوع یعنی عمود ہو اور ان کے اندر وحدانیت بھی پائی جاتی ہو جب کسی کلام میں یہ اوصاف جمع ہو جاتے

ہیں تو خود بخود ایک مشخص یعنی متعین شکل بن جاتی ہے اور اس شکل کے آئینہ میں اس کلام کے حسن و جمال کے سامنے خد و خال نظر آنے لگتے ہیں۔"

عمود یعنی مرکزی موضوع کے متعلق امام فراہی کا خیال ہے کہ "اگر کسی نے کسی سورہ کا عمود معلوم کر لیا تو اس کو اس سورہ کے نظام کو سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ عمود کا علم در اصل نظم کے گنج مخفی کی کلید ہے لیکن اس کا حصول کچھ آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ خود سورہ کے مضامین پر بار بار غور کیا جائے اور اس کے علاوہ آس پاس کی سورتوں کا بھی اور ان سورتوں کا بھی جو زیر غور سورہ کے مماثل ہوں پوری دقت نظر سے مطالعہ کیا جائے اور ان کے مطالب پر بار بار نگاہ ڈالی جائے۔ اس اہتمام کے بغیر کسی سورۃ کا عمود معلوم کرنا نہایت مشکل ہے، عمود کی روشنی جب مل جاتی ہے تو اس سے پوری سورہ جگمگا اٹھتی ہے اور سورہ کی ہر آیت انگوٹھی کے نگینہ کی طرح اپنی اپنی جگہ پر جڑی جاتی ہے اس کے بعد پوری سورہ کا حسن نظام اس طرح نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتا ہے کہ کسی آیت کی مکرر تاویل کے لئے کوئی گنجائش سرے سے باقی ہی نہیں رہتی۔ عمود سورہ، نظم کلام اور ربط آیات کی روشنی میں صرف اسی تاویل کو تسلیم کر سکتا ہے جو سیاق و سباق کے لحاظ سے ارجح اور اثبت ہو۔"

مولانا نظم کے ثبوت اور اس کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے اپنی کتاب مقدمہ تفسیر میں ایک جگہ فرماتے ہیں: "پھر نظم قرآن کی سب سے بڑی شہادت ان لوگوں کا علم الیقین ہے جن پر حسن ترتیب کے محاسن کچھ بے نقاب ہو گئے ہیں اور جنھوں نے ان حقائق کی کوئی تجلی دیکھ لی ہے جو نظم قرآن کے اندر ودیعت ہیں۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ کتاب الٰہی حکمت، اسرار و عجائب کا ایسا عظیم الشان خزانہ ہے جس کی کلید صرف نظم ہے۔ یہ حیران کن ذوق جستجو کو شہ دیتی ہے اور ان کی طاقت و بصیرت میں اضافہ کرتی ہے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ اس مخفی خزانہ کو آشکارا کریں۔"

امام فراہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے نظام القرآن کی ایسی واضح اور صاف شاہراہ نکالی جس پر چل کر ہر آدمی قرآن کا صحیح معنی و مفہوم سمجھ سکتا ہے۔ انھوں نے "فاتحہ نظام القرآن" میں تفسیر قرآن کے نہایت قیمتی اور بنیادی اصولوں کی نشاندہی کی۔ اصول تفسیر سے متعلق ایک الگ رسالہ "التکمیل فی اصول التاویل" مدون کیا۔ در اصل امام موصوف کے یہاں ربط و نظام کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے نزدیک قرآن پاک کی تمام سورتیں اور ساری آیات ربط و نظام کے سنہری تاروں سے بندھی ہوئی ہیں۔

ہر آیت اپنے ماقبل و مابعد کی آیت سے اور ہر سورہ اپنے ماقبل و مابعد کی سورہ سے گہرا تعلق رکھتی ہے اور اس تعلق کا پتہ چلانا ہر طالب قرآن کے لئے ناگزیر ہے۔

علامہ فراہی کی اس شاہراہ پر بعد کے تمام مفسرین گامزن نظر آتے ہیں۔ گرچہ انھوں نے نظام قرآن کو ہر جگہ دکھانے میں کامیابی حاصل نہ کی لیکن اپنی ہمت و صلاحیت کے بقدر قرآنی آیات و سور میں نظم و ربط پیدا کرنے اور اس کی تحقیق کرنے کی کوششیں کیں۔ علمائے عرب میں اس گروہ میں ڈاکٹر عبد اللہ دراز کی النبأ العظیم، ڈاکٹر بنت الشاطی کی التفسیر البیانی للقرآن الکریم، جامعہ اسلامیہ مدینہ کے ایک استاد احمد حسن کے مقالات، شیخ مبارک کی من منہل الادب الخالد، احمد احمد بدوی کی من بلاغۃ القرآن، مصطفی صادق الرافعی کی اعجاز القرآن وغیرہ اس مکتبہ فکر سے کم و بیش متاثر ہیں۔ علمائے ہند میں مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا سید ابو الاعلی مودودی وغیرہ نے اپنے اپنے ذوق و طبیعت اور وسعت نظر کے لحاظ سے اسی آفتاب علم سے اکتساب نور حاصل کیا ہے۔ لیکن مولانا امین احسن اصلاحی تو براہ راست مولانا فراہی کے شاگرد تھے۔ وہ کئی سال تک ان کی صحبت میں رہے، اور ان سے خاص طور پر مستفید ہوتے رہے۔ انھوں نے اپنی تفسیر تدبر قرآن میں قدم قدم پر فراہی اصولوں سے خوشہ چینی کی ہے۔

مولانا مودودی اگرچہ نظم قرآن کی اصطلاح استعمال نہیں کرتے لیکن اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں آیات کا باہم تعلق قائم کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے باخبر نظر آتے ہیں کہ قرآن کا جدید طالب علم جب قرآن کھولتا ہے تو حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اعتقادی مسائل، اخلاقی ہدایت، شرعی احکام، دعوت، نصیحت، عبرت، تنقید، ملامت، تخویف، بشارت، تسلی، دلائل، شواہد، تاریخی قصے، آثار کائنات کی طرف اشارے بار بار ایک دوسرے کے بعد آ رہے ہیں۔ ایک ہی مضمون مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دہرایا جا رہا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر وہ اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ یہ ایک غیر مرتب، غیر مربوط اور منتشر کلام ہے، جو اول سے آخر تک بے شمار چھوٹے بڑے مختلف شذرات پر مشتمل ہے۔

اس کے بعد مولانا مودودی یہ مشورہ دیتے نظر آتے ہیں کہ اگر پڑھنے والے کو موضوع، مقصد و مدعا، مرکزی مضمون، انداز بیان اور اس کے مخصوص طرز تعبیر اور اصطلاحی زبان سے آشنائی ہو تو وہ کبھی ان بے سروپا خیالات کو جگہ نہ دیگا۔ قرآن کا موضوع انسان اور اس کی نجات ہے، مرکزی مضمون صحیح رویہ ہے جو انسان کو خلیفہ بناتے وقت خدا نے خود بتا دیا تھا، قرآن کا مدعا انسان کو اس صحیح رویہ کی طرف دعوت دینا

اور اللہ کی اس ہدایت کو واضح طور پر پیش کرنا ہے جسے انسان اپنی غفلت سے گم اور اپنی شرارت سے مسخ کرتا رہا ہے۔

مولانا مودودی کہتے ہیں کہ قرآن کہیں اپنے موضوع، اپنے مدعا اور مرکزی مضمون سے بال برابر بھی نہیں ہٹا ہے۔ اول سے لے کر آخر تک اس کے مختلف النوع مضامین اس کے مرکزی مضمون کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے ایک ہار کے چھوٹے بڑے رنگ برنگ جواہر ایک رشتے میں مربوط و منسلک ہوتے ہیں۔ مزید برآں "قرآن ایک دعوت کے ساتھ نازل ہونا شروع ہوا اور وہ دعوت اپنے آغاز سے لے کر اپنی انتہائی تکمیل تک تئیس سال کی مدت تک جن جن مرحلوں اور جن جن منزلوں سے گزرتی رہی ان کی مختلف النوع ضرورتوں کے مطابق قرآن کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے، ظاہر ہے کہ ایسی کتاب میں وہ تصنیفی ترتیب نہیں ہو سکتی جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لئے کسی مقالے میں اختیار کی جاتی ہے"۔

یہاں ایک سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن اپنے موضوع، مدعا اور مرکزی مضمون سے کہیں نہیں ہٹا تو ان چیزوں میں باہمی ربط ہونا چاہئے اور پورے قرآن کو منظم، مربوط اور باہم پیوستہ ہونا چاہئے۔ اسی طرح سوال یہ نہیں ہے کہ قرآن کے اندر کوئی ترتیب اور مناسبت ہے یا نہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب میں کون سا نظم اور کون سی ترتیب پوشیدہ ہے؟ مولانا مودودی نے یہ بات کہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اس ترتیب سے نہ رکھا جس ترتیب کے ساتھ وہ نازل ہوا تھا۔ اگر قرآن کو نزولی ترتیب پر مرتب کیا جاتا تو وہ ترتیب بعد کے لوگوں کے لئے اس صورت میں بامعنی ہو سکتی تھی جبکہ قرآن کے ساتھ اس کی پوری تاریخ نزول اور اس کے ایک ایک جزو کی کیفیت نزول و شان نزول لکھ کر لگا دی جاتی اور وہ لازمی طور پر قرآن کا ایک ضمیمہ بن کر رہتی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر موجودہ ترتیب میں کون سی حکمت اور دانش کارفرما ہے اور اعجاز کا مخفی راز کیا ہے، مولانا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے تدبر قرآن میں فراہی اصولوں کے مطابق قرآن کی تفسیر کرنے اور نظام اور ربط تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا اصلاحی کے نزدیک نظم قرآن کے حق میں متعدد دلائل ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ ابتدا ہی سے علماء کا ایک گروہ ایسا موجود رہا ہے جو نظم قرآن کا قائل رہا ہے۔ اس گروہ کے بعض لوگوں نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ علم نظم قرآن کی

[illegible]

دوسری بات یہ ہے کہ جن علماء نے نظم قرآن کا انکار کیا ہے ان کے انکار کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ نظم قرآن کے خلاف متحد اور مطمئن ہیں بلکہ جن لوگوں نے نظم کا دعویٰ کیا وہ بھی کوئی ایسی چیز نہ پیش کر سکے جو اس راہ میں قسمت آزمائی کرنے والوں کا حوصلہ بڑھاتی۔ چنانچہ لوگوں نے نظم کی تلاش کو کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق سمجھ لیا۔ [۲۵]

تیسری بات یہ ہے کہ اگر فی الواقع قرآن میں کوئی نظم نہیں ہے تو بہترین ترتیب نزولی ہوتی لیکن ایسا نہیں ہوا، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص ہدایات کے تحت خاص خاص آیات کے لیے خاص خاص مواقع متعین کیے گئے۔ [۲۶]

چوتھی بات یہ ہے کہ قرآن متعدد سورتوں میں منقسم ہے، یہ نظم ہی کا تقاضا تھا کہ قرآن مختلف سورتوں میں منقسم ہے، ورنہ پورا قرآن ایک ہی سورۃ پر مشتمل ہوتا۔ [۲۷]

پانچویں بات یہ ہے کہ قرآن کی ترتیب مقداری بھی نہیں ہے، سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی، اور کتنی ہی چھوٹی سورتیں ہیں جو اپنی سے بڑی سورتوں پر مقدم ہیں۔ یہ سورتوں کی حد بندی بھی نظم قرآن کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ [۲۸]

آخری بات یہ ہے کہ نظم کلام کسی کلام کا ایسا جزو لاینفک ہوتا ہے کہ اس کے بغیر کسی عمدہ کلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ قرآن جس کو فصاحت و بلاغت کا معجزہ قرار دیا جاتا ہے اسے نظم سے خالی کتاب سمجھا جاتا ہے۔ [۲۹]

البتہ یہ بات یہاں قابل ذکر ہے کہ فراہی اور اصلاحی تصورات نظم میں کچھ فرق بھی پایا جاتا ہے۔ [۳۰] مثال کے طور پر علامہ فراہی کے یہاں نظم کی بنیادی اکائی سورہ ہے، ہر سورہ کا ایک مرکزی مضمون ہے، قرآن کی تمام سورتیں باہم دگر مربوط اور منظم ہیں۔ پورا قرآن نو گروپ میں منقسم ہے اور ہر گروپ کی انفرادی خصوصیات ہیں۔ [۳۱] ہر گروپ ایک مکی سورت سے شروع ہوتا اور مدنی سورہ پر ختم ہوتا ہے۔ [۳۲] لیکن مولانا اصلاحی کے نزدیک قرآنی سورتیں سات گروپ میں منقسم ہیں اور تمام سورتیں چند ایک کو چھوڑ کر ایک دوسرے کی مثنیٰ ہیں۔ ہر سورہ زوج زوج ہے۔ دونوں سورتوں میں اس طرح کی مناسبت ہے جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ [۳۳]

ایک نمایاں فرق دونوں حضرات کے یہاں یہ ہے۔ مولانا اصلاحی کے نزدیک ہر گروپ پہلے مکی

سورتوں پر اور پھر مدنی سورتوں پر مشتمل ہے۔ [۳۴] مکی سورتوں کی ترتیب اور پھر مدنی سورتوں کی ترتیب میں ہر گروپ میں ان کے یہاں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا جبکہ امام فراہی اس ترتیب پر مصر نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر فراہی کے آٹھویں گروپ میں جو سورہ ۶۷ سے سورہ ۱۱۲ تک پر مشتمل ہے، ۷۶، ۹۸ کی سورتیں ہیں پھر سورہ ۱۱۰ مدنی ہے اور اس کے بعد سورہ ۱۱۱ دوبارہ مکی ہے۔ [۳۵] لیکن مولانا اصلاحی کے نزدیک سورہ ۱۱۱ بھی مکی ہے اور اس طرح مکی سورتوں کی ترتیب برقرار رہی ہے۔ [۳۶]

مولانا اصلاحی کے خیال میں ہر گروپ کے اندر اسلامی دعوت کے تمام ادوار ابتداء سے لے کر انتہا تک نمایاں ہوئے ہیں، البتہ نمایاں ہونے کا پہلو ہر ایک کے اندر مختلف ہے [۳۷]، لیکن مولانا فراہی کے یہاں اس طرح کی کوئی وضاحت نہیں ملتی۔

مولانا اصلاحی کی تفسیر تدبر قرآن کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ:

۱- مولانا اصلاحی کا طریقۂ تفسیر واضح، جامع اور ہمہ گیر ہے۔ مولانا نے قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ آیات کے نظم اور ان کی تاویل کے تعین میں اصل اعتماد قرآن ہی کے شواہد و نظائر پر کیا ہے بلکہ الفاظ و اسالیب کی مشکلات میں بھی قرآن ہی سے استفادہ کیا ہے۔ اس انداز تفسیر کو جامع اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا بنیادی محور نظم پر ہے۔ انفرادی سورتوں میں نظم کی تحقیق مثنیٰ سورتوں میں ربط کی جستجو اور پھر گروپ سورتوں کے مابین مناسبت اور تعلق کی تلاش نے پورے قرآن کو ایک دوسرے سے مربوط اور منظم کر دیا ہے اور قرآن ہی کے الفاظ میں کتاباً متشابہاً مثانی حسین اور دل آویز تصویر بن گئی ہے۔

۲- مولانا اصلاحی کی یہ تمام کوششیں مولانا فراہی سے مستعار یا مستفاد ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ ان کی اپنی تخلیق نہیں ہے یا قرآنی خدمات میں ان کا یہ کارنامہ ثانوی ہے بلکہ مولانا فراہی کے اصولوں کو عملی جامہ پہنا کر مولانا اصلاحی نے انھیں حیات جاوید بخش دی ہے اور یہ افکار بڑے غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کے بعد ہی اختیار کیے گئے ہیں۔ مزید برآں بہت سے معاملات میں مولانا فراہی سے ہٹ کر اصلاحی صاحب نے نئی شاہراہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔

۳- مولانا اصلاحی کی اس تفسیر سے اس تحریک ادبیات قرآنی کو تقویت ملی ہے جس کے روح رواں اس صدی میں سید قطب شہید، ڈاکٹر زکی مبارک، ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی، ڈاکٹر

عبداللہ دراز وغیرہ رہے ہیں۔ ان حضرات کا زور اس امر پر زیادہ رہا ہے کہ قرآن کا ادبیاتی اور اسلوبیاتی مطالعہ ہونا چاہئے تاکہ اس کے معجز نما ادب کا حسن وجمال کھل کر سامنے آسکے۔ دورِ جدید کے اس رجحان کو مولانا اصلاحی کی یہ تفسیر عملی جامہ پہناتی نظر آتی ہے۔

۴۔ مولانا اصلاحی کا یہ نظریۂ نظم قرآنی خود دو آیات سے مزین ہوتا نظر آتا ہے۔ مولانا کا اصرار ہے کہ انھوں نے جو طریقۂ تفسیر اختیار کیا ہے وہی قرآن کی روح سے ہم آہنگ ہے، اور نظم کی روشنی میں کسی ایک تاویل کی ہی گنجائش باقی رہ سکتی ہے بقیہ تاویلیں یا تو غلط ہوں گی یا سیاق وسباق سے انحراف کا نتیجہ ہوں گی۔ لیکن دوسرے مفسرین کے نزدیک یہ نظم نمایاں اور قابل توجہ نہیں رہا۔ مزید برآں نظم کی روشنی میں غور کرنے کے باوجود آپس میں تاویلوں کا اختلاف ہو سکتا ہے جیسا کہ مولانا اصلاحی اور مولانا فراہی کے درمیان بعض آیتوں کی تاویل میں اختلاف پایا جاتا ہے[۲۹]

تعلیقات وحواشی

۱۔ ان حضرات کے یہاں نظمِ قرآن کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ابوبکر نیشاپوری کے بارے میں علامہ سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے لکھا ہے کہ "سب سے پہلے جس شخص نے علم مناسبت کو ظاہر کیا وہ ابوبکر نیشاپوری ہیں۔ (الاتقان فی علوم القرآن طبع ۱۳۱۸ھ مصر ج ۲ ص ۱۳۲) امام رازی اپنی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں "قرآنی حکمتوں کا بڑا حصہ اس کے نظم وترتیب میں پوشیدہ ہے" (ایضاً) قاضی ابوبکر بن عربی اپنی کتاب سراج المریدین میں لکھتے ہیں کہ "آیاتِ قرآنی کے باہمی تعلق کو اس طرح سمجھنا کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط کلام کے قالب میں ڈھل جائیں ایک عظیم الشان علم ہے" (ایضاً)

علامہ ابو جعفر کی تصنیف "البرہان فی ترتیب سورۃ القرآن" اسی موضوع پر ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے۔ الاتقان کے مصنف سیوطی نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب "تناسق الدرر فی تناسب السور" تصنیف فرمائی جس کا تذکرہ الاتقان ج ۲ ص ۱۳۲ پر موجود ہے۔ اس مسلک کے علمبردار ایک عالم علامہ ولی الدین ملویؒ ہیں۔ نظمِ قرآن سے متعلق ان کا ارشاد ہے کہ "جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا نزول چونکہ حالات کے تقاضوں کے تحت تھوڑا تھوڑا کر کے ہوا ہے اس وجہ سے اس میں نظم نہیں [illegible]

کا نزول بلاشبہ حسب حالات جستہ جستہ ہوا ہے لیکن اس کی ترتیب میں نہایت گہری حکمت ملحوظ ہے۔

(الاتقان ج ۲ ص ۱۳۲)

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے خاکسار کا مضمون "اعجاز قرآن اور نظم کلام"۔ ماہنامہ الرشاد اعظم گڈھ، نومبر ۱۹۸۳ء ص ۶-۱۲

۲۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت جلد دوم ص ۲۷۹، ۲۸۰

۳۔ اخبار الاخیار ص ۱۴۲ مطبع مجتبائی دہلی

۴۔ تبصیر الرحمن وتیسیر المنان، الجزء الاول ص ۳، مطبع بولاق مصر

۵۔ جزء الاول ص ۴۹

۶۔ تفصیل کے لئے راقم کا مضمون دیکھئے، قرآن مبین کے ادبی اسالیب، تحقیقات اسلامی علی گڑھ جلد ۳ شمارہ ۲، اپریل، جون ۱۹۸۴ء

۷۔ شیخ کے حالات کے لئے دیکھئے، نزہۃ الخواطر ص ۱۹۷، ڈاکٹر سالم قدوائی، ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں، مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۵۲-۵۸، شیخ کے متعلق معلومات اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

۸۔ جلد پنجم ص ۱۱۳-۱۱۴

۹۔ بیان القرآن جلد اول ص ۱۴۴، ایڈیشن کتب خانہ رحیمیہ دیوبند۔

۱۰۔ فی ظلال القرآن، تفسیر آیت مذکورہ، دوسرا ایڈیشن، الجزء الثانی ص ۸۴-۸۵

۱۱۔ بلاغت کی زبان میں اس اسلوب کو عود علی البدء کہا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں دیکھنے کے لئے ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون: قرآن مبین کے ادبی اسالیب، تحقیقات اسلامی علی گڑھ ج ۳ شمارہ ۲ ص ۹۲، ۹۶

۱۲۔ الفرق بین المناسبۃ والنظام ص ۷، ۸

۱۳۔ دلائل النظام ص ۷۵۔ تصویر المعانی وسکنی فی صورہ۔

۱۴۔ ایضاً ص ۷۶

۱۵۔ فاتحہ نظام القرآن ص ۱۵، دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح اعظم گڈھ، طبع اول

۱۶۔ یہ کتاب اس حیثیت سے نہایت قابل قدر ہے کہ اس میں موصوف مصنف نے نظم کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ امام فراہی سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ آخر میں موصوف نے بطور نمونہ سورۂ بقرہ کے [illegible]

سید لطیف حسین کاظمی
ریسرچ اسکالر شعبۂ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اقبال کی شاعری میں مردِ مومن کا تصوّر

(۲)

(۲) فقر و استغنا | عقل و خرد کی اہمیت کو اقبال تسلیم کرتے ہیں چونکہ فکر سے کائنات کو تسخیر کرنے کی قوت اور حق و باطل اور خیر و شر میں تمیز کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ انسان زمان و مکان کو فکر اور ذکر الٰہی سے تسخیر کرتے ہوئے مقامات عروج کی جانب سفر کرتا ہے اور جب عالم علیٰ ملاء سے گزر کر عالم الکاشفہ میں داخل ہوتا تو یہاں وہ مقام آتا ہے جسے اقبال اپنی فکری لغت میں "فقر" کا نام دیتے ہیں۔ اگرچہ تصوف میں یہ فنا فی اللہ کا درجہ ہے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، اقبال کے یہاں خودی عشق سے مستحکم ہو کر ذات حق میں فنا نہیں ہوتی بلکہ اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے خدا کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور اس طرح فقر و استغنا سے "مردِ مومن" میں خدائی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اقبال فقر کے مفہوم کو یوں واضح کرتے ہیں:

فقر مومن چیست تسخیر جہات — بندہ از تاثیر او مولا صفات
مقام فقر ہے کتنا بلند شاہی سے — روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہئے
خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی — نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر

(۳) صبر و بردباری | اقبال کے "مردِ مومن" کی سیرت شخصیت کی انفرادی اور اجتماعی تعمیر و ارتقاء کیلئے صبر و بردباری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اقبال اپنی تقریروں کے مجموعہ "تشکیل جدید الٰہیات اسلامی" (RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM) میں فرماتے ہیں کہ "انسان اپنی خودی کو اسی صورت میں مستحکم و مضبوط کر سکتا جبکہ وہ دوسروں کی خودی کو عزت کی نگاہ سے دیکھے، اور اپنی خودی کی اتنی اہمیت دے۔ یہ صرف صبر اور بردباری (TOLERANCE) کے عظیم گُن کی وجہ سے ہی ممکن ہے۔ اقبال اپنی شاعری اور فکر کے ذریعے "مردِ مومن" کے لئے صبر و قناعت اور بردباری کے ساتھ عالمگیر بھائی چارے (UNIVERSAL BROTHERHOOD) کو ضروری سمجھتے ہیں، اور اس کا درس دیتے ہیں۔ یہاں قناعت سے اقبال جو مل جائے اس پر راضی رہنا۔

کو نہیں سمجھتے بلکہ تعمیر خودی کے لئے لگاتار سخت مشکلات اور "تلخ کلامی" کو برداشت کرنے سے تجویز کرتے ہیں۔ بردباری خودی کو توانائی بخشتی ہے نہ کہ اسے کمزور و نحیف بناتی ہے۔ انسانیت کے احترام کیلئے حُسن سلوک، نرم و نیک کلامی "مردِ مومن" کا شیوہ ہے کیونکہ اسی کی بدولت وہ پوری دنیا کو فتح کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں اقبال کے چند فارسی اشعار غور طلب ہیں:

حرف بد را بر لب آوردن خطاست — کافر و مومن ہمہ خلق خداست
آدمیت احترام آدمی — با خبر شو از مقام آدمی

(۴) جذبۂ حُریت | اقبال اپنی شاعری میں "مردِ مومن" کو "مردِ حُر" سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ اس مردِ حُر کی تعمیر اور بتدریج ترقی کے لئے حُریت فکر و عمل اہم شرط ہیں۔ اقبال کا کہنا ہے کہ غلامی کی زنجیریں نہ صرف جسم کو بلکہ فکر و ضمیر کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور انسان بے جان بے چشم اور بے روح ہو جاتا ہے۔ ایک بندۂ حُر ہی انسانی صلاحیتوں کے نامحدود امکانات کی تلاش و جستجو کر کے عملی جامہ پہنا سکتا ہے اور حیات و کائنات میں انسانی خودی کے مقام اور اس کی تقدیر کا تعین کر سکتا ہے کیونکہ بقول اقبال "بندۂ آزاد خود ایک معجزۂ کرامات ہے"۔ غلامی موت ہے اور آزادی زندگی، غلامی جمود ہے، زنگ ہے، اور ذوق ایجاد و نمود دونوں کے لئے سنگین رکاوٹ ہے جبکہ آزادی مستحکم خودی کے لئے کوشش پیہم (CONSTANT STRUGGLE) ہے ذوق تخلیق کا گُر اور اصل ہے۔ غلامی اور آزادی سے متعلق علامہ کے چند اشعار:

جان بھی گروِ غیر بدن بھی گروِ غیر — افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام — ہے اس کی نگہ فکر و عمل کیلئے مہمیز

آزادی ذوق حسن و زیبائش کو تقویت دیتی ہے جبکہ غلامی سے سوائے محرومی کے کچھ حاصل نہیں۔ علامہ اس جانب یوں اشارہ کرتے ہیں:

غلامی کیا ہے ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی — جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر — کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

(۵) کسب حلال | مردِ مومن کی خودی کی تعمیر و ارتقاء کے لئے ایک ضروری شرط کسب حلال ہے۔ علامہ اقبال کے یہاں اس عنصر کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو انسان حلال کی کمائی

کھاتا ہے۔ اس سے دوسروں کی مدد کرتا ہے وہی مرد مومن ہو سکتا ہے کیونکہ کسب حلال ہی سے انسان اپنے اور دوسروں کے حقوق کی حفاظت کر سکتا ہے جو انسان جائز طور سے اپنی روزی یا دیگر زندگی کے لئے ضروری اشیاء مہیا نہیں کرتا وہ خائن و حق تلف ہے۔ وہ مرد کامل کی فہرست میں نہیں آسکتا۔ گویا اقبال کے نزدیک کوئی بھی شے جو بغیر کام کئے یا محنت و مشقت برداشت کئے حاصل کی جائے وہ انسانی شخصیت کے لئے بری ہے اور اس سے "خودی" بجائے مستحکم ہونے کے کمزوری اور تنزل کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اقبال موروثی چیز کو بھی "کسب حلال" سے باہر سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

پشیماں شو اگر لعلے ز میراث پدر خواہی — کجا عیش برون آوردن لعلے کہ در سنگ است

اسی طرح اقبال ادھار لئے گئے یا چرائے گئے تصورات (IDEAS) کی بھی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرد مومن بذات خود ایک معجزہ ہے، کرامات کا مجموعہ ہے، تخلیق کا سرچشمہ ہے لہذا اس کی ذاتی اختراع ہی اس کی فطرت کا مظہر ہے۔ مرد مومن کبھی دوسروں کی لگائی ہوئی روشنی میں چلنا پسند نہیں کرتا۔ اقبال اس ضمن میں یوں فرماتے ہیں:

ز خاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست — تجلی دگرے در خور تقاضا نیست

ضرب کلیم میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

ہو کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوگا — چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تو تو اتر جا
یہ مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر — ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

کسب حلال سے مردان خدا میں جو کردار کی تعمیر ہوتی ہے اسی شمع سے زمانہ منور ہوتا ہے۔

زمانہ کہ جسے آفتاب کرتا ہے — انھیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

(۶) اثبات حیات و ذوق نمود | کلام اقبال کا بغور مطالعہ کرنے سے ہمیں جس بنیادی عنصر کی نشاندہی ملتی ہے وہ ہے ان کا زندگی کے معنی و مفہوم کی تلاش کرتے ہوئے انسان کے مقام کی جستجو کرنا۔ اس تلاش و جستجو میں حیات و کائنات کے جو اسرار و رموز ان پر منکشف ہوئے ان کا اظہار انھوں نے اعلیٰ انداز میں اپنی شاعری میں کیا ہے۔ مختصر یوں کہ اقبال کے نزدیک زندگی وقت یا زمان (TIME) میں مسلسل حرکت کا نام ہے۔ یہ حرکت مسلسل تخلیقی ہے اور اس سے

نہ صرف زمان و مکان میں انسان کے مقامات و مدارج کا تعین ہوتا ہے بلکہ یہ ارتقائی منازل کی نشاندہی کرتے ہوئے طبیعاتی (METAPHYSICAL) سطحوں کو چھوتی ہے اور "خودی" کی عظمت کا انکشاف کرتی ہے۔ زندگی اقبال کے لئے ایک کوشش پیہم اور جہد مسلسل کا نام ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی — ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے — سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار — تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

حیات کا جوہر یہ ہے کہ وہ نئی نئی آرزوئیں اور نئے نئے نصب العین پیدا کرتی ہے۔ جہد پیہم سے وہ اپنی پوشیدہ قوتوں اور استعدادوں کو بروئے کار لاتی ہے۔ اس طرح اگر موجودہ دنیا انسان کے لئے ناکافی ثابت ہو تو وہ اسے تبدیل کر دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک وہی دنیا انسان کی حقیقی دنیا ہے جسے وہ خود پیدا کرے۔

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا — یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

یہ کائنات مسلسل تبدیل ہوتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی (CHANGE) قانون قدرت ہے۔ اس طرح کائنات نامکمل ہے۔ لمحہ بہ لمحہ یہ ارتقائی منازل کو طے کرنے کے لئے تبدیل ہوتی اور بڑھتی رہتی ہے۔ اقبال اس مفہوم کو کتنے خوبصورت پیرائے میں بیان کرتے ہیں:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون
فریب نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

زندگی انکشاف ذات ہی سے غذا حاصل کرتی ہے۔ اس طرح اگر زندگی میں اپنے آپ کو ظاہر کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ موت کے برابر ہے:

بے ذوق نمود زندگی موت — تعمیر خودی میں ہے خدائی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے — گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

اس سے بڑھ کر اقبال کے یہاں ذوق نمو اور نئی نئی اختراع میں مرد مومن، خدا کی قوت تخلیق تک

کو ایک طرح سے چیلنج کرتا نظر آتا ہے مثلاً

تو شب آفریدی چراغ آفریدم ۔۔۔ سفال آفریدی ایاغ آفریدم

اصل میں یہ مردِ مومن، علمِ الٰہی سے فیضیاب اور عرفانِ ذات کی دولت سے مالا مال ہے اسی لیے یہ 'مردِ کامل' کہے جانے کا بھی مصداق ہے۔ (اقبال کے یہاں 'مردِ کامل'، 'مردِ مومن' اور بعض جگہ 'مردِ حُر' کا استعمال دراصل ایک ہی ہستی کے مختلف نام ہے)۔

(۱) تسخیرِ کائنات اور عروجِ آدم | اقبال کی فکر میں انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز خودی کا شعور ہے اپنے نفس کی معرفت سے وہ کائنات میں اپنے مقام کی تلاش و جستجو میں سرگرم ہو جاتا ہے۔ خودی کی ابتدائی منزلیں مادّے پر فتح پانے اور تلاش و جستجو کی منزلیں ہیں۔

اقبال نے بانگِ درا میں خاص طور سے "سرگذشتِ آدم" اور "انسان اور بزمِ قدرت" جیسی نظموں میں انہی منازل کی نشاندہی کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ تمام موجودات اس تجسس میں سرگرمِ سفر ہو کر ادنیٰ سے اعلیٰ منزلوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ انسان کی پوشیدہ صلاحیتیں جب ظاہر ہو کر اپنی ذات اور مخالف عناصر کو فتح کرتے ہوئے اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں تو درجہ بدرجہ مقامِ شوق طے ہوتے رہتے ہیں اور انسان مقامِ عروج پر پہنچ جاتا ہے جو اس کی "خودی" کا منتہیٰ ہے۔ گویا انسان پہلے عالمِ محسوسات کو عقل و خرد سے حل کرتا ہے اور جب اسے طبیعی PHYSICAL امور پر فتح و قدرت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ مابعد الطبیعاتی (META PHYSICAL) دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ یہ کشف کی دنیا ہے جہاں انسانی خودی جب مادہ پر فتح پا کر با اختیار ہو جاتی ہے اور عشق و محبت سے استحکام پا کر زمانہ یا وقت پر غالب آ جاتی ہے تو بقائے دوام (ETERNITY) پا لیتی ہے۔ یہاں انسان کی مرضی خدا کی مرضی بن جاتی ہے بلکہ اس بلندی پر پہنچ کر اللہ تعالیٰ اس کی رضا طلب کرتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے:۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ۔۔۔ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

عروجِ آدم یہ وہ منزل ہے جہاں مکاں و لامکاں دونوں اس کے شکار اور اس کی کمند کے اسیر ہو جاتے ہیں:۔

دو عالم می شود روزے شکارش ۔۔۔ فتد اندر کمندِ تابدارش

فروغِ آدمِ خاکی ز تازہ کاری ہاست ۔۔۔ مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

مولانا روم نے بھی انسان کی اس منزل کو مقامِ کبریا سے تعبیر کیا ہے:۔

از فلک برتریم و ز ملک افزوں تریم ۔۔۔ زیں دو چرا نگذریم، منزلِ ما کبریاست

یہی 'مردِ مومن' کا مقام ہے جہاں وہ 'کفِ تقدیرِ جہاں' ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں ایسے ہی آدمی کی تلاش خدا کو بھی ہے:۔

خدا در جستجوئے آدمی زاد ۔۔۔ خدا خود در تلاشِ آدمی ہست

اور یہ کائنات، یہ چاند ستارے سب "خودی" کی اعلیٰ منزل یعنی عروجِ آدم کے منتظر ہیں۔ اقبال اس ضمن میں فرماتے ہیں:۔

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام ۔۔۔ یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک
عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں ۔۔۔ کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

الغرض اقبال کے نزدیک "مردِ مومن" کی حیات کا مدعا دیدارِ ذات ہے اور اسی آخری منزل پر ذاتِ حق کا جلوہ میسر آتا ہے لہٰذا:

بر مقامِ خود رسیدن زندگی است ۔۔۔ ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

متذکرہ بالا "مردِ مومن" کے مختصر اوصاف و تشریحات سے اقبال کی شاعری اور فکر میں "مردِ مومن" کے تصور کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ ان کے علاوہ نہ جانے کتنے اوصاف ایسے ہیں جن کی سرسری طور سے بھی یہاں وضاحت ممکن نہیں جو اس کی خودی میں موجود ہیں۔ تاہم اس مختصر جائزہ سے ہر خاص و عام اقبال کے اس تصور کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے

ویسے تو اقبال کے پورے کلام میں "مردِ مومن" اور اس کے اوصاف و کمالات اور عظمت و مرتبت کے اشارے جا بجا ملتے ہیں اور عموماً اس کی فکر کا مرکز "انسان" ہی ہے لیکن واضح طور سے جو نمونہ ہمیں اس کی فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" میں انسانی شخصیت سے متعلق ملتا ہے وہ خاص طور سے اہمیت کا حامل ہے۔ ویسے تو میں نے 'خودی' کی تعمیر و استحکام سے متعلق 'اسرارِ خودی' سے متعدد اشعار کا حوالہ دیا ہے مگر چونکہ یہاں تفصیل سے اقبال کے اس فارسی کلام کی تفسیر ممکن نہ تھی لہٰذا میں نے مفہوم کی طرف ہی اشارہ مناسب سمجھا۔

خودی کی تعمیر و ارتقا کے لیے جن اہم گُروں اور شرائط کو میں نے پیش کیا اُن سب کا خلاصہ "اسرارِ خودی" میں بڑے فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے، گویا اقبال نے "انسان" کے تصور کے سمندر کو کوزے جیسی "اسرار" میں بند کیا ہے۔ انھوں نے مختصر اور جامع طور سے "خودی" کی تکمیل و ترتیب کے لیے تین مراحل پیش کیے ہیں:

(۱) اطاعتِ الٰہی (OBEDIENCE) (۲) ضبطِ نفس (SELF CONTROL)

(۳) نیابتِ الٰہی (VICE GERENCY)

اطاعت کا مفہوم یہ ہے کہ آئینِ حیات (قرآنِ مقدس و شریعتِ رسولؐ) کی پابندی کی جائے، اس میں دین کے تمام اصول و فروع شامل ہیں۔ لیکن چونکہ خدا تمام زیست کی آخری بنیاد ہے اسی لئے خدا کی اطاعت دراصل، انسان کی اصلی وجودی ماہیت کا نام ہے جو ابدی ہونے کے ساتھ تنوع اور تبدیلی میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ ضبطِ نفس، تعمیر و تکمیل کا دوسرا مرحلہ ہے۔ ضبطِ نفس نام ہے اس قدرت کا جو نفس کی کمزوریوں یا قلبی برائیوں پر عبور حاصل کرنے سے حاصل ہوتی ہے گویا اقبال کے نزدیک تعمیرِ خودی کا یہ مرحلہ بنیادی طور سے اُن بے جا نفسانی خواہشات پر کنٹرول کا ہے جو انسانی شخصیت کی ترقی و ارتقاء کے راستے میں مانع ثابت ہوتی ہیں۔ مختصراً یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ جب آدمی اپنے نفس کو پہچان لیتا ہے اور ضبطِ نفس پر قادر ہو جاتا ہے تو وہ حیات و کائنات کو مسخر کر لیتا ہے۔ اس طرح اطاعت اور ضبطِ نفس کے بعد تعمیرِ خودی کے مراحل ختم ہو جاتے ہیں اور دونوں کا ثمر، دونوں کا نتیجہ صریحاً ایک منزلِ مقصود پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ منزل ہے نیابتِ الٰہی کی جو فی الحقیقت إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً کی تشکیل و تعبیر ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اقبال کے اس شعر میں "خودی" کی تعمیر و ارتقا کے تینوں مراحل کا نچوڑ ملتا ہے۔ وہ شعر ہے:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم　　جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مضمون ختم کرنے سے پہلے میں یہ مناسب سمجھوں گا کہ چند اہم امور کی جانب بھی اشارہ کرتا چلوں تاکہ اقبال کے "مردِ مومن" کے تصور کی وضاحت اور آسانی سے ذہن نشین ہو سکے۔ ان امور میں مردِ مومن کے تصور سے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ اور وضاحت پیش کرنا مقصود ہے۔

یہ غلط خیال عام ہے کہ اقبال نے "مردِ کامل" (SUPER MAN) کا تصور نیٹشے (NIETZSCHE) سے لیا ہے، حالانکہ اسلام میں یہ تصور پہلے سے موجود تھا۔ خود اقبال کا بیان ہے کہ انھوں نے تصوف کے مسئلہ انسانِ کامل پر کوئی بیس برس ہوئے لکھا تھا جبکہ نیٹشے کا گزر اُن کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ دوسری حقیقت جو اس بیان کے جواز میں پیش کی جا سکتی ہے وہ یہ کہ نیٹشے وجودِ باری کا منکر تھا جبکہ اقبال اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سرے سے اس نظریے کا مخالف ہی نہیں بلکہ دشمن ہے۔ اقبال نے نیٹشے کے فوق البشر (SUPERMAN) کے تصور پر جو تنقید کی ہے وہ اسی نقطۂ نظر سے کہ اس کا مفروضہ فوق البشر "خودی" کی اس قوت سے محروم ہے جو عرفانِ رب سے حاصل ہوتی ہے۔ اقبال کے نزدیک جو نیٹشے کی وقعت ہے اس کا ذکر یوں کیا ہے:

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں　　تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم　　نگاہ چاہیے اسرارِ لا الٰہ کے لیے

لیکن بعض حیثیت سے نیٹشے کے افکار اسلام سے بہت قریب ہیں جس کا اعتراف اقبال نے یوں کیا ہے:

آنکہ بر طرحِ حرم بتخانہ ساخت　　قلبِ او مومن دماغش کافر است

تیسری اہم بات جو نیٹشے کا "انسانِ کامل" کے تصور میں اقبال کا ماخذ ہونے کے انکار میں پیش کی جا سکتی ہے وہ یہ کہ اقبال نے اپنے تحقیقی مقالے "فلسفۂ عجم" (THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA) میں عبدالکریم جیلی کے مشہور تصورِ انسانِ کامل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"الجیلی کا خیال ہے کہ انسانِ کامل کائنات کا محافظ ہے لہٰذا تسلسلِ فطرت کے لیے انسانِ کامل کا ظہور ایک لازمی شرط ہے۔ یہ ذہن نشین کر لینا آسان ہے کہ ہستیٔ مطلق جو اپنی مطلقیت کو چھوڑ چکی تھی، پھر انسانِ کامل میں واپس آ جاتی ہے۔ اور بغیر انسانِ کامل کے اس کے لیے ایسا کرنا ناممکن تھا کیونکہ اس کے بغیر نہ تو فطرت کا وجود ہوتا اور نہ وہ روشنی ہی ہوتی جس کے ذریعہ سے خدا اپنے آپ کو دیکھ سکتا۔ وہ روشنی جس کے

ذریعے سے خدا اپنے آپ کو دیکھتا ہے اس وقت انسان کی روح سے وجود میں آتی ہے خود ہستی مطلق کی ذات میں موجود ہے۔" (ترجمہ انگریزی اقتباس صہ۱۳)

اقبال کے دا جیلی کے اس تصور انسان کامل کو بیان پیش کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ اسلام میں انسان کامل کا تصور پہلے سے موجود تھا۔ چونکہ الجیلی ۷۶۷ھ ہجری میں پیدا ہوا جبکہ نیٹشے کی پیدائش تیرہویں صدی ہجری یعنی ۱۸۴۴ء عیسوی ہے لہذا نیٹشے سے بہت پہلے اگر الجیلی نے اس تصور کو پایا ہے تو یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ انہی تعلیمات اسلامی کی روشنی میں اقبال نے بھی اس تصور کی جو گیر اساس "انسانی خودی" کو اپنا کر تصور انسان کامل کو اپنی شاعری اور فکر میں مرکزی و امتیازی مقام دیا۔ اور اسے عام کیا۔ لہذا یہ کہنا کہ اقبال کے مرد مومن یا مرد کامل کے تصور کا ماخذ نیٹشے ہے، بالکل غلط اور حقیقت کے منافی ہے۔

مرد مومن کے تصور سے متعلق دوسری عام غلط فہمی اقبال کے کلام ہی کی ہے کہ وہ ایک طرف "اسرار خودی" میں "خودی" کے استحکام پر زور دیتے اور اس کی عظمت و رفعت کو پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف "رموز بیخودی" میں اسے (انسانی خودی) کو جماعت یا ملت میں گم ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اقبال نے اسرار و رموز میں فرد (انسانی خودی) اور معاشرے پر جو خیالات اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پیش کئے وہ اس لحاظ سے اہم ہیں کہ جماعت یا ملت فرد کو گم یا منضم نہیں کرتی بلکہ اس میں رہتے ہوئے جہد حیات میں حصہ لیکر فرد اپنی "خودی" کو مستحکم کرتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال دو متضاد باتیں کر رہے ہیں۔ ایک طرف تو وہ استحکام خودی پر زور دیتے ہیں دوسری طرف کہتے ہیں:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں
فرد را اندر جماعت گم شود — قطرہ وسعت طلب قلزم شود

یہ اور اس طرح کے بہت سے اردو، فارسی اشعار بادی النظر میں جماعت کو فرد پر فوقیت دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اقبال کے پورے نظام فکر میں "خودی" یا اعزاز یعنی فرد انسان کے اختیار اور تخلیقیت کے احترام کو ملحوظ رکھیں تو اس نتیجے پر پہنچنے میں دقت نہ ہوگی کہ اقبال کا فرد یا "مرد مومن" اپنی آزادی اور تخلیقیت کا اظہار جماعت میں رہ کر ہی کر سکتا ہے تارک الدنیا راہب بن کر نہیں۔

اس طرح جماعت یا ملت "خودی" کے استحکام کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ مثالی جماعت بھی اقبال کے نزدیک افراد کا بے مقصد اور اقدار (روحانی اقدار) سے محروم ہجوم نہیں بلکہ مردان مومن کی وہ منظم سوسائٹی ہے جس میں سے ہر فرد اپنی خودی کے استحکام کے لئے کوشاں ہے۔ الغرض اقبال جماعت اور فرد میں تصادم کی جگہ ایک طرح کا اشتراک ڈھونڈتے ہیں، اور دونوں کو ان کا مناسب مقام دیتے ہیں۔ لہذا مرد مومن کے تصور میں اسرار و رموز دونوں کو متضاد سمجھنا غلطی ہے۔

اب آخر میں سوال یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک "مرد مومن" کی نمائندگی کرنے والے مثالی کردار کون ہیں؟ اس کا مختصر جواب یوں ہے کہ اقبال تمام مسلمانوں کی طرح پیغمبر محمدؐ مرتبت کو افضل البشر مانتے ہیں ان کی اردو فارسی شاعری عشق رسولؐ میں ڈوبی ہوئی ہے مثلاً معراج مصطفےٰ کا وہ "بال جبریل" میں یوں ذکر کرتے ہیں:

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰ سے مجھے — کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اس کے علاوہ چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو — وصال مصطفوی، افتراق بولہبی
نوع انساں را پیام آخریں — حامل او رحمۃ للعٰلمیں

اقبال اپنی شاعرانہ جولانیوں میں خداوند تعالیٰ سے تو شکوہ کرتے ہیں اور حد ادب میں اسکے سامنے انسانی عظمت کا رجز بھی پڑھتے ہیں لیکن رسول مقبولؐ کے حضور وہ سراپا نیاز بن جاتے ہیں۔ ارمغان حجاز میں فرماتے ہیں:

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقام محمد عربیؐ است
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

اسی عظیم المرتبت شخصیت یعنی رسول کریمؐ کے نور سے کردار کی توانائی حاصل کرنے والی دوسری مقدس و معتبر ذاتیں بھی ہیں جنھیں اقبال "مرد مومن" کی مثالیں سمجھتے ہیں۔ انکی شاعری میں جگہ جگہ فقر حیدرؓ، عشق سلمانؓ، صدق بوذرؓ، صدق خلیلؑ، صبر حسینؓ اور فقر و مسیحؑ و کلیمؑ کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت علیؓ کی شان میں انکے چند اشعار پیش ہیں:-

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے — اسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ — زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی — کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری

میرے لئے ہے فقط زورِ حیدری کافی — ترے نصیب فلاطوں کی تیزیِ ادراک

اگر مزید اس کی تفصیل دیکھنا ہے تو "اسرارِ خودی" کے وہ حصے پڑھ لیجئے جن میں انھوں نے امیرالمومنین حضرت علیؓ، رمزِ شہادت کے سلسلہ میں حضرت حسینؓ ابن علیؓ اور مثالی مومنہ جناب فاطمہؓ بنت رسولؐ کا ذکر کیا ہے۔ امام حسینؓ کی شان میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں — گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق

معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

نہ صرف مردِ مومن بلکہ مثالی مومنہ جناب فاطمہ زہراؓ کو بھی اقبالؔ نے اپنی شاعری، خاص کر "رموزِ بیخودی" میں مسلمان عورتوں کے لئے اسوۂ کاملہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان کی شان میں اقبالؔ کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جن سے اس مثالی مومنہ کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مزرعِ تسلیم کا حاصل ہیں بتولؓ — ماؤں کو اک درسِ کامل ہیں بتولؓ

اک گدائے بے نوا کے واسطے — اب تو کوئی اپنی چادر بیچ دے

علامہ کا کہنا ہے کہ اگر دنیا میں کسی کو خدا کے سوا سجدہ کرنا واجب و جائز سمجھا جاتا تو پہلے وہ جناب فاطمہ زہراؓ کو سجدہ کرتے۔ مثالی مومنہ کی اس عظیم المرتبت عظمت و اقتدار کو یوں بیان کرتے ہیں:

سامنے ہے میرے آئینِ خدا — اور فرمانِ جنابِ مصطفےٰؐ

لوٹتا ورنہ مزارِ پاک پر — سجدے کرتا جا کے اس کی خاک پر"

(ترجمہ از رموزِ بیخودی)

المختصر اقبالؔ کا "مردِ مومن" جو بظاہر ایک فلسفیانہ تصور معلوم ہوتا ہے، در اصل اسلام اپنی عظیم شخصیتوں کے اسوۂ حسنہ کے سرچشمہ سے فیضیاب ہے۔

اقبالؔ نے مذہب اور فلسفہ دونوں کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ اُن کی شاعری اور فکر کا مرکز اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انسان اور اس کی جدوجہدِ زندگی، ایک کل کی حیثیت سے کائنات میں اس کا مرتبہ اور خدا کے ساتھ تعلق و ربط کے مدارج و مقامات کا انکشاف ہے۔ اقبال نے اپنی مثالی دنیا کے لئے جس مردِ کامل کا تصور پیش کیا ہے اس کی صفات وہی ہیں جو مردِ مومن کی ہیں۔ اس تصور کی تعمیر و تخلیق میں تعلیماتِ قرآنی نے شاعر کی رہنمائی کی ہے۔ انسان اپنی ان گنت خدا داد صلاحیتوں کو اس دنیا میں بروئے کار لاکر خودی کی تعمیر کرتا ہے اور اسے مستحکم کرتے ہوئے ارتقائی منزلیں طے کرتا ہے اور اپنی شخصیت میں مکمل ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ فطری صلاحیتوں کی اس مکمل ہم آہنگی کا نام "معراجِ آدم" یا تکمیلِ خودی اور معراج ہے جو انسان کو انسانِ کامل یا اقبالؔ کی اصطلاح میں "مردِ مومن" بناتی ہے۔ اور جو انسان کی جملہ صفات پر حاوی ہے جس سے مادہ اور روح دونوں کی دنیا میں عینیت (IDEALISM) اور مشابہت (IDENTITY) کی تشکیل ہوتی ہے۔ اب آخر میں اقبالؔ نے مردِ مومن کی جو تصویر کشی خصوصاً اپنی شاعری میں کی ہے ان کی چند مثالیں پیش کرنا مناسب سمجھوں گا۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے — وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

(بقیہ قدیم چینی تہذیب)

ثانوی درجہ حاصل تھا۔ دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس کی اصلاحات کی نہ کوئی فکر تھی اور نہ تحریک۔ اس طرح کی اور بھی کئی خامیاں تھیں جو چینی سماج کے لئے زنجیرِ پا بن گئی تھیں اور ان کی ہمہ جہت ترقی میں رکاوٹ ڈال رہی تھیں۔ اسلام کے پہنچنے کے بعد چینی سماج میں جہاں قبولِ اسلام میں حیرت ناک اضافہ ہوا وہاں ان مفسدات پر اہلِ چین کو نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو ایک اعلیٰ معیارِ زندگی کے بعد قابلِ نفرت بن گئے تھے۔ تاہم جو اصلاحات کو قبول نہ کرتے ہوئے بھی اہلِ چین اسلام کے اس آفاقی فیضان سے محروم نہ رہ سکے جو ہر مذہب و ملت کے لئے عام ہے۔

۱؎ عبدالقدوس ہاشمی، چین کے دو مذاہب، فکر و نظر ستمبر [illegible] اسلام آباد۔

S.M. Jaffer, Medival India under Muslim King P.P 115

عالمِ اسلام کا جواب

تحریکِ اسلامی کے عظیم شاعر جناب نعیم صدیقی کی ایک خوبصورت نظم جس میں عالمِ اسلام کی صحیح عکاسی کی گئی ہے اور وہ افغان مجاہدین کی پکار کا جواب بن گئی ہے۔ (ادارہ)

کابل و غزنی و قندھار کے اے جانبازو!
کیوں بُلاتے ہو ہمیں
شورِ تکبیر سے ایمان کا احساس دلاتے ہو ہمیں
دستکیں دیتے ہو ہر روز، ستاتے ہو ہمیں
تو یہ کیسی غلط فہمی ہے
ہم تو مرکھپ بھی چکے
غور سے دیکھو کہ ہم لوگ تو لاشیں ہیں
زندگانی نے کیا ہم کو حنوط
ہم پہ دولت کا ہے آسیب سوار
یہی آسیب اٹھاتا ہے، بٹھاتا ہے ہمیں
یہ رُلاتا ہے ہنساتا ہے ہمیں
وہ دوڑا کے چلاتا ہے ہمیں
وہ بچاتا ہے ہمیں
ورنہ ہے دیر کی بات، اپنی وفات!

ہم ہیں ٹائی کے کفن پہنے ہوئے
آبنوسی ہیں ہمارے تابوت
آرٹ کا آئینہ ہے ان کی تراش
قوم کے گدّے ہیں، تکیے ہیں، کفن اور غلاف
مرمری لیپوں سے روشن ہیں ہماری قبریں
جھاڑ فانوس بھی ہیں
حُسن کاری کی تصاویر ہیں دیواروں پر
بعد مرنے کے بھی گھر ہے ہمارا زندہ
اپنے گھر کے ہیں ہم لوگ شہید
ہم کہ مرکھپ بھی چکے، ہم سے تعرض نہ کرو

یہ سینماؤں کی، بنکوں کی عمارات جدید
یہ مساجد کے منار و گنبد
یہ گلیاں، یہ کھڑی رستے میں یہ اپنی جاہ و جلال
اور پھر چاروں طرف جھونپڑیاں

یہ سمجھنا کہ یہ ساری ہیں ہماری قبریں
یہ ہیں پیاری قبریں
پیاری قبریں کہ جنہیں یہاں عیشِ حیات
دوزخی کہتا ہے واعظ یہ مخرب ہیں
یہ شرف پا کر برزخ ہوا جنت سامان
بعد مرنے کے ہے آرام بہت
جام ہے
طبلہ و نے
عشرت کے
اپنی تقدیر میں ہے
یہی فلموں کے پرنٹ
وی سی آر بھی تو ہے ہیں، سمگلنگ سے
ننگے جسموں کی بہار
کرتے پہنے ہوئے عریانی کے انداز لطیف
دھمال اچ، اور تھرکتے ناچ کے چکر پیہم
کاک ٹیل ___ اور تمہارے لئے جامِ صحت
ساتھ ہی شعلوں کی مانند بھڑکتے گانے
آج کل ہم نے تمہاری خاطر
اک نئے "رقص ہماری" کا کیا ہے آغاز
جنگیں ناچتی ہیں، ہاتھوں میں لئے تلواریں
صندلیں جسم بھی تلوار سے کچھ کم تو نہیں
موسیقاروں نے کیا ہے ایجاد
بہرِ تحسینِ شہیداں نیا اک نغمہ مدھر
جس کی دُھن ایسی کہ جیسے ہو لہو کی مہک
اور کیا چاہتے ہو؟
کابل و غزنی و قندھار کے اے جانبازو!
ہم سے خیرات کے پیسے لے لو
معرکے اپنے مگر خود ہی لڑو
خود جیو، خود ہی مرو
ابھی کب!
ہم تو پہلے ہی پڑے ہیں مردہ!
ابھی دو دن ہے مشکل اپنی
وقت محدود ہے، لذات کی آتی بہتات
جانے کب صورِ سرافیل کا یک گونجے
اور پھر کچھ نہ رہے
اس لئے غزنی و قندھار کے اے جانبازو!
مت پکارو ہمیں
ہم پہ کچھ رحم کرو!
ہم کو قبروں میں تو آرام سے رہ لینے دو

اپنی قبروں میں زر و سیم کا وہ سیلاب
لہریں ٹکراتی ہیں اور بنتے ہیں پیہم گرداب
ڈبکیاں کھاتے ہیں ہم
ایک اک غوطہ ہے یاں ہوش رُبا
تمہیں معلوم ہی کیا
تم تو بس لڑتے ہو اور جان لڑا سکتے ہو

کبھی اس طرح جیتے ہوئے مر کر دیکھو
اس کی موت کو گلے سے لگالو
ورنہ اتنا تو کرو، ہم کو مر جانے دو!

ہم کو کہتے ہو وفادار نہیں
ہم یہ دیتے ہیں جواب
تم مجاہد ہو، مہاجر ہو، سمجھدار نہیں
نئی تہذیب کے تم واقفِ اسرار نہیں
ورنہ یہ غیرتِ ایمان و خودی کا چرچا
حریت کے لیے ہر گام پہ کٹتے ہوئے سر
کیا عجب خبط ہے، بیٹھ کے سوچو دم بھر

خیر! اب جانے دو بیکار کی بحثا بحثی
مختصر یہ ہے کہ تم مسلم ہو
اس لیے ہم کو محبت ہے کہ تم بھائی ہو
تم مسلمان ہو بھائی ہو، تو پھر رحم کرو
ہم ہیں مُردے، ہمیں آکر نہ ستاؤ [illegible]
کفر و ایمان کی کشاکش سے ہمیں کیا مطلب؟
دن قیامت کا نہ آئے جب تک
ہمیں قبروں میں پڑا رہنے دو
فاتحہ ہم پہ پڑھو!
آگے چلو!

(بقیہ حلقہ یاراں)

سیاست سے لاتعلقی کا طرزِ عمل حقیقت پسندی سے بہت دور کی راہ محسوس ہوتی ہے۔ دعوتِ اسلامی کو اپنے فطری انداز میں پیش کرتے ہوئے باطل کا باطل ہونا واضح کر دینا چاہیے جس کے ہم مکلف ہیں اور اس کے بعد پارلیمانی سیاست سے عدم وابستگی یا طلب کی کارروائی میں حصہ لینے کے عدم جواز کی بنیاد پر مناسب طرزِ عمل یہی ہے، یہ اس لئے کہ یہ طرزِ عمل باطل کے کاروبار میں حصہ لینا نہیں ہے بلکہ حق کے لئے راہ ہموار کرنے کے لئے حصہ لینا ہے۔ ایسی تشکیل شدہ حکومت جو کچھ بھی ہے ہم اس کے مکلف نہیں ہیں۔ اس میں ہمارا حصہ سماج میں اپنے نزدیک بہتر انسانی قدروں کے فروغ کے لئے ہے۔ یہ ہے وہ عملی پیش رفت اس شکل میں جبکہ پارلیمان مختلف الخیال افراد سے بنتی ہے، اور وہ ایک دوسرے کے خیالات کو باہم سنتے ہیں اس سے علیحدہ رہ کر ایک فکر و عقیدہ کی حکمرانی کے لئے غیر فطری طریقے سے اصرار جس کے ہم مکلف نہیں ہیں مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے اس صورت میں ہماری دعوت قابلِ توجہ بن جاتی ہے۔

(۳) اس کا نتیجہ تو مزاج و رجحان کی لمحہ بہ لمحہ تبدیلی ہے، اس کے عملی نتیجے سے ہماری سرگرم دعوت جہد و عمل کے ذریعے ہی ممکن ہو سکتی ہے، نہ کوئی بھی نتیجہ محض منفی کردار ادا کرنے سے حاصل نہیں ہوا کرتا۔

والسلام
رضی الدین، جامعۃ الفلاح

(بقیہ حواشی نظم قرآن اور علماء ہند)

باہم ربط کو واضح بھی کیا ہے۔

١٧ اس کتاب کے تفصیلی تعارف کے لئے دیکھئے راقم کا مضمون "ڈاکٹر بنت الشاطی کی تفسیر بیانی کا مطالعہ" جو دو قسطوں میں ماہنامہ حیات نو، بلریا گنج، اعظم گڈھ میں جولائی اور اگست ۱۹۸۰ء کے شماروں میں شائع ہوا ہے۔

١٨ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے مقالہ "آراء المعاصر فی المناسبات" مجلۃ الجامعۃ الاسلامیۃ بالمدینۃ المنورہ جلد ۳ شمارہ ۲ دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۳۰۸

١٩ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں یہی اسلوب اپنانے کی کوشش کی ہے۔ آپ پر مولانا فراہی کا براہ راست اثر پڑا۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی حیات شبلی میں تحریر کرتے ہیں "ندوہ میں مولانا آزاد نے مولانا حمید الدین فراہی صاحب کے ساتھ کچھ دن بسر کئے جن کو قرآن پاک کے ساتھ عشق کامل تھا اور اس عشق کا اثر صحبت کی تاثیر سے مولانا ابوالکلام آزاد میں بھی سرایت کر گیا، اور یہی رنگ تھا جو نکھر کر الہلال میں نظر آیا۔" (حیات شبلی ۱۹۴۳ء ص: ۴۴۴)

ایک دوسری جگہ سید صاحب لکھتے ہیں کہ "مولانا شبلی کے اصرار سے کئی دفعہ مولانا فراہی ندوہ میں آکر رہے۔ اور طلبہ کو کبھی فلسفہ جدیدہ اور کبھی قرآن کے سبق پڑھائے۔ میں بھی اس زمانہ میں ندوہ کا طالب علم تھا، مولانا کے ان درسوں سے مستفید ہوا۔ اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی مرحوم کے پاس ندوہ میں مقیم تھے اور الندوہ کے مددگار ایڈیٹر تھے۔ وہ مولانا حمید الدین صاحب کی ان صحبتوں سے مستفید ہوتے۔ یہ اور قرآن پاک کے درس و نظر کے نئے راستوں کے نشان پانے لگے۔ اور بالآخر الہلال کے صفحات میں ان جادہ پیمائی کے مختلف مناظر سب کی نظروں کے سامنے آئے۔" (معارف شمارہ نمبر ۱ جلد ۴۷)

٢٠ مولانا دریابادی نے خود اس تاثر پذیری کا اعتراف کیا ہے۔ ملاحظہ ہو "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" ص ۹۴

٢١ مولانا مودودی نے متعدد مواقع پر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ دیکھئے، ان کا مضمون مطبوعہ الاصلاح ص: ۲۰۲، ترجمان القرآن ج ۱۹، عدد: ۴، ۵ ص ۶۱

٢٢ تفہیم القرآن جلد اول ص ۱۲، دہلی ۱۹۶۵ء

٢٣ ایضاً ص: ۱۹-۲۰

۲۴ ایضاً ص ۲۵

۲۵ ایضاً ص ۲۷

۲۶ مبادی تدبر قرآن ص ۱۶۶-۱۶۷، تدبر قرآن جلد اول کا مقدمہ ح تا ی

۲۷ تدبر قرآن جلد اول کا مقدمہ ح

۲۸ ایضاً ص: ح

۲۹ ایضاً

۳۰ ایضاً

۳۱ ایضاً

۳۲ دلائل النظام ص: ۹۲ - ۹۳

۳۳ ایضاً ص: ۹۱

۳۴ تدبر قرآن ج اول کا مقدمہ ص: ل تا م

۳۵ ایضاً ص: ل

۳۶ دلائل النظام ص: ۹۳

۳۷ تدبر قرآن ہشتم ص ۶۲۸ - ۶۳۰

۳۸ ایضاً جلد اول ص: ن

۳۹ یہ نکات ڈاکٹر میر مستنصر کے غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ سے ماخوذ ہیں۔ دیکھئے:

Thematic And Structural Coherence in the Quran:
A study of Islami's concept of Nazm.
The University of Michigan 1983 P.P. 166-172.

محمد مسعود عالم القاسمی
ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

قدیم چینی تہذیب کا مطالعہ

چینی تہذیب مشرقی تہذیبوں میں انتہائی قدیم خیال کی جاتی ہے۔ بلکہ بعض ثابت شدہ مواد یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس کی قدامت دنیا کی دوسری تہذیبوں کے مقابلہ میں بھی کچھ کم نہیں ہے۔ چینی تہذیب کی ساخت افکار ونظریات اور عقائد واعمال کے ساتھ سماجی رسوم علاقائی آداب واطوار اور جغرافیائی حالات سے ہوئی ہے۔ اہل چین کا مذہبی تصور بہت زیادہ واضح اور محکم نہیں ہے۔ بدھ مت، تاؤ مت اور کنفیوشش کی تعلیمات چین کا اصل سرمایہ ہیں۔ چینی مذہب میں زمانہ قدیم سے جن عناصر کا غلبہ رہا ہے وہ اہل چین کی اجداد پرستی اور مظاہر پرستی رہی ہے جو کسی نہ کسی شکل میں آج بھی باقی ہے۔ مظاہر پرستی کا عالم یہ ہے کہ چاند، سورج، آسمان ستارے، دریا، پہاڑ، درخت، ہوا، پانی، بجلی اور ان جیسے تمام مظاہر میں روح الوہیت ان کو جاری وساری نظر آتی ہے اور ان کے آگے اہل چین عقیدت واحترام سے جھک جاتے ہیں۔ اور اجداد پرستی کا حال یہ ہے کہ چینی گھروں میں مٹی، دھات ولکڑی کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا بت ہوتا تھا بلکہ آج بھی اکثر روایتی گھروں میں موجود ہے جس کو صبح وشام سلام کیا جاتا ہے اور ان سے دینی لیاقت کی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ یہ بت الہ کے آباء اجداد اور روح اعلیٰ کے ہوتے ہیں جن کی ارواح چینیوں کے عقائد کے مطابق ان میں مقیم ہے[۱] اور چینی تہذیب میں عبادت کا یہی طریقہ رائج ہے[۲]۔ چینی تہذیب میں مقتدر اعلیٰ ([illegible]) کا تصور بھی ملتا ہے۔ ایک عرب سیاح مسعودی ۳۳۲ھ نے چین کا سفر کیا تھا انھوں نے اہل چین کی مذہبی زندگی پر اس طرح روشنی ڈالی ہے: "ان کا مذہب پہلے لوگوں کا مذہب ہے اور یہ ایک فرقہ ہے جس کا نام سمینہ ہے جن کی پوجا کا طریقہ وہی ہے جو اسلام سے پہلے قریش کا تھا، بتوں کو پوجتے ہیں اور دعاؤں میں ان کی طرف منہ کرتے ہیں۔ ان میں جو سمجھدار ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس بت کی حیثیت محض قبلہ کی ہے اور جو نادان ہیں وہ ان بتوں کو خدا کا درجہ دیتے ہیں (مروج الذہب اول ص ۲۹۸)

چینی تہذیب ایک عرصہ تک دیسی تہذیب کی حیثیت سے چین کے جغرافیائی نقشہ میں سمائی رہی ہے اس کو زندہ اور متحرک کرنے بلکہ اسے دوسری تہذیبوں کی صف میں لانے میں اہم رول [illegible]

کا نہ دوست رول، با پ چہ، فا یہ یا گ کو بعد میں لاؤزے (جہاں دیدہ) کا لقب ملا تھا۔ انہوں نے نہ صرف چینی کی فکری بنیادیں تلاش کیں بلکہ ان کو چینی معاشرہ میں نافذ کرنے کی بھی کوشش کی۔ لاؤزے نے کتاب داؤ کے نام سے ایک نوشتہ چھوڑا ہے جس کا ابتدائی حصہ انتہائی مختصر اور ناقابل فہم ہے، جبکہ دوسرا حصہ نسبتاً آسان اور قابل فہم ہے۔ شانگ تو ولے لاؤزے کے افکار کی تکمیل و تشریح کی جو اس کا شاگرد تھا۔

لاؤزے کے افکار کی جو تشریح کی گئی ہے اس کے مطابق وہ تاؤ (یعنی فطرت) کے احکام کی پیروی کو نظام زندگی کی اساس قرار دیتا ہے، مگر تاؤ بجائے خود کیا ہے؟ وہ اس کی تشریح نہیں کرتا، نیز یہ کہ وہ اس نظام زندگی کی تفصیل بھی نہیں بیان کرتا جس کے نفاذ کا وہ حامی یا داعی ہے البتہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ تاؤ سے دو اثرات صادر ہوتے ہیں (۱) ین Yin اور (۲) یانگ Yang (۱) قوائے سلبی اور (۲) قوائے ایجابی۔ اول عالم طبیعی کی اصل ہے اور دوم موثر عالم طبیعی کی، یہ کبھی باہم ملتے ہیں اور کبھی جدا ہو جاتے ہیں۔ انھیں دو احوال واثرات سے اشیائے عالم وجود پذیر ہوتی ہیں[۵۲]۔ اس نظریہ کے مطابق مجرم کو پھانسی دینا انتہا درجہ کی بات ہے، جہاں اچھے عامی وہم مرنے کے بعد بھی دائمی زندگی ملنے کا تصور ملتا ہے مگر برے اعمال کے مکافات کا کوئی تصور نہیں ملتا[۵۳]۔ تاؤمت میں پانچ قواعد اصلی، جو محرم ہیں (۱) قتل نہ کرو (۲) جھوٹ مت بولو (۳) شراب نہ پیو (۴) چوری نہ کرو (۵) زنا نہ کرو (۶)[۵۴]

چینی تہذیب میں دوسرا مصلح کنگ فوزے[۵۵] ہے جسے کنفیوشس کے نام سے جانا جاتا ہے چینی تہذیب پر اس کے بڑے گہرے اثرات ہیں اور وہ خود لاؤزے کی تعلیمات سے متاثر ہے۔ کنگ فوزے نے نے چینی سوسائٹی میں فکری اساسیات میں کوئی ترمیم و اضافہ نہیں کیا بلکہ خود ان کا پیرو رہا اور عقائد و عبادات کے مروج نظام میں رہتے ہوئے اور اسی کی تاکید و توثیق بلکہ ان کو علامت محبت قرار دیتے ہوئے کچھ اخلاقی تعلیمات دیں اور اصلاحات کیں، انھوں نے مردوں کو امانت و صداقت اور عورتوں کو عفت وادب کی تعلیم دی۔ اس کی تعلیمات کی بنیاد یہ ہے کہ ہر شخص فطرتاً نیک پیدا ہوتا ہے اور یہ نیکی تعلیم و تربیت اور مطالعہ کتب کے ذریعہ مکمل ہوتی ہے۔ کنگ فوزے ایک مخلص انسان تھا اور وہ انسانوں کی ہمدردی اور خدمت کا قائل تھا۔ اس نے وقت کے حکمرانوں تک اپنی اصلاحات کا پیغام پہنچایا مگر اس کا کوئی ثمرہ برآمد نہ ہوا اور حالات کی سختی نے اسے دل برداشتہ کر دیا۔ اس کی وفات کے صدیوں بعد لوگوں کو اس کی تعلیمات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس ہو سکی[۵۶]۔ اس حکیم کی طرف ایک کتاب "مکتوب تعالیم حکیم" منسوب ہے

جس میں حسب ذیل مباحث ملتے ہیں (۱) شو کنگ (اسناد تاریخی) (۲) شی کنگ (اشعار و ترانے) (۳) یی کنگ (ارتقام و تضاد) (۴) لی کی (عبادات و اذکار) (۵) چون چیو (رسالہ فلسفہ اخلاق اور جزا)

چین شروع ہی سے ایک بڑا ملک ہے، کثرت آبادی کی بنا پر ایک ممتاز مقام کا حامل رہا ہے لیکن وسائل ذرائع معاش کی کمی اور سامان زندگی کے فراہم کرنے کے جوش و جہد نے چینی سماج کو ایک خاص رخ دیا۔ چینی باشندوں میں جفاکشی، محنت کوشی، مسلسل جد و جہد، استقامت یہاں تک کہ اس راہ میں جان دینے سے بھی گریز نہ کرنا ایسی چیزیں ہیں جن کا ان کی تہذیب پر گہرا اثر ہے، چنانچہ ان خصوصیات نے چینیوں کو صنعت و حرفت اور علم کاروبار میں بہت آگے بڑھایا ہے اور چینی تہذیب میں کمی تنوع اور ارتقاء کے بغیر ایک قسم کا تسلسل نظر آتا ہے۔

چینی سماج میں ایک طرف سماجی اور معاشی حالات کا دباؤ رہا ہے اور دوسری طرف مذہبی اور ثقافتی سطح پر لاؤزے کی سلبی اور ایجابی تعلیم ہے، غالباً اسی وجہ سے چینی تہذیب میں ایک قسم کا ٹھہراؤ سا نظر آتا ہے یا پھر اس کی وجہ ایک طویل زندگی ہے جو بغیر کسی اضطراب اور ہنگامہ کے بسر ہوتی ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس ٹھہراؤ کی وجہ چینیوں کا اپنے آپ میں محصور (Confined) ہونا ہے، جو خارجی دنیا سے کما حقہ استفادہ کرنے سے روکتا ہے۔ جہاں تک چینی اپنے بزرگوں کا احترام کرتے ہیں وہ اپنے بزرگوں میں سے بعض و قتوں کے ساتھ ایک ایسی زندگی بسر کرتے ہیں جو [illegible] مذہب اور ان [illegible] لیکن چینی سماج میں جماعت کی خدمت کی اگرچہ وہ خود بہت محترم اور وہ دور تک پھیلی ہوئی تھی لیکن یہ خدمت پوری انسانیت کی خدمت کے مرادف نہیں ہو سکتی، رفتہ رفتہ یہ ترقی گوشہ نشینی اور قناعت پسندی میں گم ہو گئی۔ رسوم و رواج جو ایک جگہ کافی دنوں تک چل چل کر رچ بس جاتے ہیں اور اپنے بزرگوں کی روایات پر عمل کرنے سے پیدا ہو جاتے ہیں چینی سماج کی رگوں میں منجمد خون کی طرح نظر آتے ہیں، نہ تو ان میں کوئی حرکت اور تازگی پیدا کر سکتے ہیں اور نہ کسی تہذیبی ترقی کی سمت میں قدم بڑھانے میں معاون ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

اہل چین اپنے رسوم و رواج پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، حالات و زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ ان میں بس اسی قدر تغیر ہوتا ہے جس کی ضرورت انتہا تک پہنچ گئی ہو۔ قدیم چینی سماج کی رسوم میں ایک دلچسپ چیز یہ ہے کہ امیروں اور شریفوں کے یہاں جب لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اس کے دونوں پاؤں

پرورش بھی بیٹ کو ہمیشہ باندھے رکھتے ہیں اور وہ ولادت سے ہی بلوغ تک یعنی جب تک قوت نامیہ باقی رہتی ہے بڑھنے کی بجائے جوں کی توں رہتی ہے۔ اس تدبیر کا حاصل یہ ہے کہ جوان عورتوں کے پاؤں چار پانچ انگل سے زیادہ کبھی نہیں بڑھتے۔ وہ چلنے پھرنے سے ایک طرح سے معذور ہو جاتی ہیں اور بغیر تکلیف کے یا بغیر سہارے کے چلنا مشکل ہوتا ہے لیکن باوجود اس معذوری کے، اس کا ایسا خبط ہے کہ عورتیں بخوشی اسکو گوارا کرتی ہیں، کہ معیار حسن وہاں یہی ہے۔ ؎

قدیم چینی تہذیب میں مصلحین کی تعلیمات سے قطع نظر کچھ چیزیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو بنیادی انسانی اور اخلاقی تمدن کے منافی ہیں اور شاید اسی وجہ سے چینی تہذیب ایک ادبی تہذیب سے زیادہ اہمیت کے قابل نہیں سمجھی گئی۔ فروغ اسلام کے ابتدائی ایام میں ایک مسلم سیاح سلیمان تاجر چین کی سیاحت کو جاتا ہے واپس آکر اپنا سفرنامہ مرتب کرتا ہے جس میں چینی تہذیب و معاشرت سے متعلق بہت سی باتوں کا انکشاف کرتا ہے۔ منجملہ ان میں یہ بھی بتاتا ہے کہ آدم خوری چینی مذہب اور قانون میں جائز ہے اور علانیہ انسانی گوشت ان کے بازاروں میں بکتا ہے۔ چینیوں کا قاعدہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی قوم جب اسی ملک کی دوسری قوم پر غلبہ حاصل کرتی ہے تو ان کو بالکل تباہ کر دیتی ہے اور وہاں کے باشندوں کو مار کر کھا جاتی ہے۔ ؎

چین کا تیسرا مذہب بدھ مت ہے مگر اس کا سارا زور اخلاقی نظام، رہبانہ عمل اور ترک دنیا پر ہے، اسی لئے وہ معاشرہ کی اصلاح میں اور فاسد رسوم کے سدھار میں حصہ لینے سے گریز کرتا ہے۔ چینیوں میں اخلاق باختگی اور جنسی اعمال میں پستی و رکاکت بھی نظر آتی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اسکی وجہ ان کا معلق مذہبی نظام ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ اس نظام کا ان مفسدات کی اصلاح میں موثر رول نظر نہیں آتا۔ عمل قوم لوط ایک مسلمہ غیر فطری جرم ہے جو ہر قوم و تہذیب میں قابل مذمت ہے مگر چینی سماج میں پوری طرح رائج ہے۔ سلیمان تاجر اپنے سفرنامہ میں اس بات کا برملا تذکرہ کرتا ہے کہ چین والے چھوکروں کے ساتھ عمل قوم لوط کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں چینیوں میں ایک دستور یہ بھی تھا کہ جو عورتیں شادی نہیں کرتیں اور بیسوا بننا چاہتی ہیں تو وہ اپنے علاقے کے پولیس افسر کے پاس جا کر بیسوائی کے رجسٹر میں اپنا نام درج کراتیں وہاں سے ان کو اجازت نامہ ملتا اور وہ سرکاری خزانہ میں سالانہ ٹیکس ادا کرتیں، اجازت نامہ میں یہ بھی لکھ جاتا کہ اس عورت سے باقاعدہ جو کوئی عقد کرے گا قتل کیا جائے گا۔ گویا اباحیت کو چینی سماج میں

پاس پڑوس

طارق لطیف فلاحی

آشہ بے نظیر اور پاکستان

" ۱۹۷۱ء سے ۷۷ء تک پارٹی کو برسر اقتدار ہونے کا موقع ملا لیکن یہ پورا عرصہ بھی پارٹی نے نامردگیوں کے ساتھ گذارا جبکہ اس کے دوران اسے کسی خارجی چیلنج کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پھر اس نے ملک کی جماعتوں، صحافیوں، طالب علموں، اساتذہ، وکلاء، مزدوروں، علمائے کرام اور دیگر طبقوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا اس میں بھی جمہوریت کا کوئی شائبہ نظر نہیں آیا بلکہ یہ بدترین مطلق العنانیت کا دور تھا جس میں عدالتوں کے اختیارات سلب ہوئے، ان میں رٹ پٹیشن کا اختیار تک باقی نہ رہا، بنیادی حقوق معطل رہے۔ دفعہ ۱۴۴ اور ڈی پی آر یعنی ایمرجنسی کا تسلط قائم رہا۔ ابتدائی دور میں دنیا کا نرالا عوامی مارشل لا بھی نافذ رہا۔

جمہوریت کے ساتھ پہلی بدسلوکی یہ کی گئی کہ ۷۰ء کے انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ اقلیتی پارٹی نے اقتدار کا مطالبہ کیا اور اکثریتی پارٹی کو انتقال اقتدار کی اجازت نہ دی۔ اس رویے نے ملک کو دو لخت کر دیا اور بچے کھچے ملک میں، اقلیتی پارٹی نے اکثریت کا روپ دھار کر اپنا اقتدار قائم کر دیا۔ اس پارٹی کی جمہوریت پسندی کا آخری امتحان ۷۷ء کے انتخابات تھے جس میں بدترین دھاندلی کی گئی اور خود بھٹو صاحب کے مقرر کردہ چیف الیکشن کمشنر نے ان دھاندلیوں کی توثیق کی، پوری قوم اس جمہوریت کشی پر کھول اٹھی اور اس نے سڑکوں پر نکل کر اور عظیم قربانیاں دے کر اپنی متحدہ قوت سے اس پارٹی کے اقتدار کا خاتمہ کر ڈالا۔

ملک میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد پیپلز پارٹی کی محرومی اقتدار کا دور شروع ہوا۔ اب یہ موقع تھا کہ پارٹی اپنے ماضی کا جائزہ لے کر فسطائیت سے تائب ہوتی اور جمہوری اصولوں پر پارٹی کو استوار کرتی مگر اس نے اپنی فسطائیت پسندی میں مزید قدم آگے بڑھایا اور تخریب کاری کا راستہ اختیار کیا۔ اس کے بطن سے الذوالفقار نے جنم لیا۔ اس کے چیئرمین کے صاحبزادگان نے الذوالفقار کی قیادت سنبھالی، چودھری ظہور الٰہی، ظہور الحسن بھوپالی، طارق رحیم اور دوسرے متعدد افراد اس کے ہاتھوں قتل ہوئے، طیارے اغوا ہوئے، جیلیں اور لاک اپ ٹوٹنے لگے، ریل کی پٹریاں اکھاڑی گئیں، لفظوں کے معنی تبدیل ہوئے، قاتل

جیل قرار دیے گئے اور مقتول کسی ہمدردی کے مستحق نہ سمجھے گئے۔ اس کردار کے ساتھ آخر میں پی۔ پی کو ایک جمہوری پارٹی کیسے تسلیم کیا جائے۔" تکبیر ۲۴ جولائی ۸۶ انٹرنیشنل اردو ڈیلی پاکستان۔

برصغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش کا مورخ جب تاریخ مرتب کرے گا تو جیسے ہی اس کا قلم پاکستان کی تقسیم اور بنگلہ دیش کے قیام کے اسباب رقم کرے گا سب سے پہلا اور سب سے آخری سبب ذوالفقار علی بھٹو کو قرار دیگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے ہٹلر کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور اسی انداز پر اپنی حکومت چلانا چاہتے تھے۔ ان کی حکومت کی ایک جھلک درج ذیل اقتباس میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ بھٹو کی جمہوریت ایک ایسی جمہوریت تھی جس کی خواہش اہل پاکستان بقید ہوش و حواس نہیں کر سکتے۔ اور صدیوں تک اسے یاد رکھیں گے یہ جمہوریت ایسی تھی جس سے بدترین مارشل لا بھی شرما جائے اور آج پھر اسی جمہوریت کو قائم کرنے کے لئے بھٹو مرحوم کی صاحبزادی بے نظیر بھٹو اٹھی ہیں۔ باپ اور بیٹی کی جمہوریت میں کتنی مماثلت ہے ۱۴ اگست کے مظاہرے کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں: "سیاسی تحریکوں میں پولیس مظاہرین پر گولی چلاتی ہے اور اس سے تحریکوں کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ یہ پہلی تحریک تھی جس میں مظاہرین کی طرف سے پولیس پر پتھراؤ ہوا، اور فائرنگ کی گئی۔ پتھراؤ بھی مظاہرین اپنے دفاع میں کیا کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ایک گاڑی میں بھر کر کچھ سپاہی کاندھے کسی چوراہے پر پھینکیں اور گذرنے والی ٹریفک پر پتھراؤ شروع کر دیں۔ اس تحریک میں یہی ہوا ہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ بلا اشتعال بینک لوٹے گئے، ریلوے اسٹیشن جلائے گئے، ریل کی پٹریاں اکھاڑی گئیں، ایک جگہ سٹیشن ماسٹر کو ہلاک کر دیا گیا، فصلیں جلا دی گئیں، نہروں کے پشتے توڑ کر دیہات اور فصلوں کو اجاڑ دیا گیا، ایک اسکول جلا ڈالا گیا، تھانوں اور چھاؤنیوں پر حملے کئے گئے، جیلیں توڑی گئیں۔ مجرم قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔" وغیرہ (تکبیر ۴ ستمبر ۱۹۸۶ء)

شمع پاکستان بے نظیر بھٹو، رومان کے پردے سے مغربی جمہوریت کا یہ انوکھا مظاہرہ پاکستان کے لئے ایک وارننگ ہے۔ بھٹو خاندان پاکستان اور اہل پاکستان کا کبھی وفادار نہیں رہا بلکہ وہ اپنے اقتدار و کرسی اور جاہ و حشمت کے لئے پاکستانیوں کو قربانی کا بکرا بناتا رہا۔ جس نے اپنے ہوس اقتدار کو پورا کرنے کیلئے پاکستان کو دو ٹکڑے کیا اور جب بھی ضرورت محسوس ہوئی اور اقتدار خطرے میں نظر آیا پاکستان کو توڑنے سے وہ نہیں چوکیں گے۔

۱۰ اپریل ۱۹۸۶ء کو جب وہ پاکستان آئیں تو انھوں نے [illegible]

ادھر بیٹی نے یو ٹرن کیا، حکومتوں کے چکر لگائے اور ان سے حمایت کا وعدہ لیا اور ان کے خوابوں کا پاکستان تعمیر کرنے کا وعدہ کیا، کیونکہ ضیاء الحق کا پاکستان امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس وغیرہ کے خوابوں کا پاکستان نہیں تھا (اگرچہ ضیاء الحق کا پاکستان بھی آئیڈیل نہیں تاہم بھٹو سے بہتر ضرور ہے) پھر کیا تھا، ذرائع ابلاغ نے ان کو سر پر بٹھا دیا اور پاکستان میں انقلاب اب صرف چند دنوں کی بات رہ گئی۔ مگر ان کے ہوش اس وقت ٹھکانے لگے جب اہل پاکستان نے عقل و ہوش کا مظاہرہ کیا، چنانچہ ۵ جولائی ۸۶ کا یوم سیاہ بری طرح ناکام رہا اور ۱۴ اگست کا مظاہرہ بھی دم توڑ گیا۔ بی بی سی نے دوبارہ اس کی ناکامی کا اعتراف کیا اور تجزیہ بھی کیا اور ہندوستانی صحافی کلدیپ نیر نے اس طرح اپنی آرزو ظاہر کی۔

"بے نظیر کے تئیں جوش اور ہمدردی اس وقت بھی دکھائی دینی چاہیے تھی جب کراچی میں ان کو گرفتار کیا گیا۔ وہ لاہور کے لئے روانہ ہونے ہی والی تھیں کہ انہیں حراست میں لے لیا گیا۔ اس گرفتاری کے خلاف لاہور میں مظاہرہ جاری رہنا چاہئے تھا۔ یہ دو دن بعد ہی سب کچھ خاموش ہو گیا۔ کراچی میں اپنی گرفتاری سے تین دن پہلے بے نظیر نے اخبار والوں سے کہا تھا ہم ہر حال میں سرکار کو دکھائیں گے کہ جنتا کی طاقت کیا ہے، وہ کیا چاہتی ہے اور اس موقع پر ہی سرکاری پارٹی مسلم لیگ کی حیثیت کا بھی پتہ چل جائے گا۔" جس دن بے نظیر گرفتار ہوئیں اس دن تو لاہور میں جنتا اور پولیس میں خونریز جھڑپ ہوئی اور چار نوجوان مارے گئے لیکن دوسرے دن مظاہرین کی تعداد اچانک گھٹ گئی۔ نیو پارک کے مطابق مظاہرین کی تعداد مشکل سے دو ہزار رہی ہوگی۔ اور اس کے بعد تو سارا معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔" (انقلاب ۱۰ ستمبر)

پاکستان اور پاکستانیوں کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ بے نظیر سے کنارہ کش ہو جائیں وہ خود ہی دم توڑ دیں گی بصورت دیگر بے نظیر دو پاکستان تو ختم کر سکتی ہیں لیکن متحدہ پاکستان کو ترقی کے منازل پر نہیں لے جا سکتیں۔ فیصلہ اہل پاکستان کے ہاتھ میں ہے۔

(بقیہ حواشی قدیم چینی تہذیب)

۵۳ علی اصغر حکمت، نہ گفتار در تاریخ ادیان ص ۹۳ تہران ۱۳۴۱ ۵۴ ایضاً ص ۴۷

۵۵ چین کے دو مذاہب ۵۶ نہ گفتار ص ۵۶

۵۷ نہ گفتار در تاریخ ادیان ص ۹۵ ۵۸ جان ایلس لینڈ مختصر تاریخ تمدن ص ۴۰ لاہور ۱۹۶۹ء

۵۹ Encyclopadia of religion and ethics

۶۰ ڈاکٹر [illegible] تاریخ چین ص ۶۷ – ۹۱ کلکتہ ۶۱ سفرنامہ سلیمان ص ۶۶

۶۲

سید اسعد گیلانی، پاکستان

افغان مہاجر کیمپ

"تحریک اسلامی کے مشہور ادیب و انشا پرداز جناب سید اسعد گیلانی کی تازہ ترین تصنیف "افغان مجاہدین" کا ایک باب۔" (ادارہ)

روس کے حملے میں جس چیز کا خطرہ جان و مال کی تباہی سے بھی زیادہ افغان محسوس کرتے ہیں وہ ایمان کی تباہی، ضمیر کی غلامی اور متاعِ اسلام کے لٹ جانے کا خطرہ ہے۔ افغانوں نے پہلے وسط ایشیا کی مسلم آبادی کا حال دیکھا ہوا ہے۔ اس صورت حال سے دوچار ہونے کے لئے افغانستان کا مسلمان تیار نہیں ہے۔ وہ جنگ برحق کر دنیا میں بھٹک سکتا ہے، بدترین جانی و مالی تباہی کا نشانہ بن سکتا ہے۔ اپنے بچوں کا دنیوی مستقبل خطرے میں ڈال سکتا ہے، اپنے گھر بار، کھیتیاں، کاروبار اور وطن چھوڑ سکتا ہے لیکن وہ اپنی متاعِ ایمان و اسلام کو نہیں لٹ سکتا جو روس کے حملے اور قبضے کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ روسی غلبہ کی صورت میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جو چیز خطرے سے دوچار ہوتی ہے وہ متاعِ ایمان ہے۔ یہ افغانستان کی مسلم آبادی کا متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ ایمان سے محروم ہو کر اپنے گھروں میں رہنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ افغان ایمان کی دولت بچا کر در بدر بھٹکنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اپنی متاعِ ایمان و ضمیر و اسلام کی حفاظت کے لئے اتنی بڑی قربانی دے رہے ہیں کہ جس کی مثال صحابہ کرامؓ کے بعد افغان مسلمانوں نے ہی پیش کی ہے۔

افغانستان سے پاکستان کی طرف آنے والے مہاجرین کی یہ ہجرت میرے نزدیک قرآنی احکام کے بھی عین مطابق ہے۔

ترجمہ: جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین پر کمزور اور بے بس تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔ (سورۃ النساء، ۹۷)

یہ ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو ایمان لائے لیکن جب ان کے لئے اپنے ماحول میں ایمان پر قائم رہ کر زندگی

گزارنا مشکل کر دیا گیا تو وہ ایمان بچانے کے لئے ہجرت کرنے کے بجائے نیم مسلمانہ اور نیم کافرانہ زندگی بسر کرنے پر راضی رہے لیکن اپنے ایمان کو بچانے کے لئے دارالاسلام مدینہ کی طرف ہجرت نہ کی۔ یہی ان کا ظلم تھا جس کا تذکرہ اس آیت میں کیا گیا ہے۔ اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی مشہور تفسیر "تفہیم القرآن" میں لکھا ہے:

"جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو اس کے لئے نظام کفر کے تحت زندگی بسر کرنا صرف دو ہی صورتوں میں جائز ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اسلام کو اس سرزمین پر غالب کرنے کی جدوجہد کرتا رہے جس طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے ابتدائی پیرو کرتے رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو اور سخت نفرت اور بیزاری کے ساتھ وہاں مجبورانہ قیام رکھتا ہو۔ ان دو صورتوں کے سوا ہر صورت میں دارالکفر کا قیام ایک مستقل معصیت ہے اور اس معصیت کے لئے یہ کوئی معقول عذر نہیں ہے کہ ہم دنیا میں کوئی ایسا دارالاسلام پاتے ہی نہیں ہیں جہاں ہم ہجرت کر کے جائیں۔ اگر کوئی دارالاسلام موجود نہیں ہے تو کیا خدا کی زمین میں کوئی پہاڑ یا کوئی جنگل بھی موجود نہیں ہے جہاں آدمی درختوں کے پتے کھا کر گزر بسر کر سکتا ہو تاکہ احکام کفر کی اطاعت سے بچا رہے۔"

ان احکام کی روشنی میں دیکھا جائے تو مسلمانان افغانستان کی پاکستان کی طرف ہجرت قرآن کے ان احکام کی روشنی میں بھی ایک اسلامی فرض کی ادائیگی اور روس جیسے ملحد بے دین اور تشدد پسند قوت کے ملحدانہ تسلط سے بچ کر ایک ایسی سرزمین کی طرف ہجرت ہے جہاں وہ ایمان و اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ یہ ہجرت شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن کے انہی احکام ہجرت کی پابندی کی روشنی میں نظر آتی ہے۔

ہر نیا دن ہجرت کرنے والوں میں اضافہ کرتا ہے اور ہر شب قافلے افغانستان سے ہجرت کر کے پاکستان کی سرحد عبور کرتے ہوئے آتے اور پاکستان کی سرحدوں پر مقیم ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کی شرافت اور دیانت داری ہے کہ وہ پاکستان میں گھس کر عام آبادی میں گھل مل جانے اور بے شمار اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پیدا کرنے کے بجائے سرحدوں پر خیمہ زن ہو جاتے ہیں، ان بنجر زمینوں اور لق و دق پہاڑوں میں جہاں کسی کی کھیتی اور زمین کو کوئی نقصان نہیں ہے۔

انھوں نے مقامی آبادی کی گزر گاہوں میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے، وہ جگہ جگہ چل پھر کر اپنی حاجت

بیان کرتے اور اپنی ضروریات کی کفالت کے لئے لوگوں کے سامنے اپیل کرتے دکھائی نہیں دیتے۔ وہ غیرت و حمیت کا پیکر اور صبر و شکر کا مجسمہ بن کر ہماری سرحدوں پر پہریداروں کی طرح بیٹھے ہیں۔ گرمی کی شدید دوپہر میں بھی اور جنوری دسمبر کی شدید سرد راتوں میں بھی وہ صبر و شکر سے پاکستان کے کنارے پر بیٹھ کر اپنے دین و ایمان کو بچائے ہوئے پڑے ہیں۔

پھر اسی قدر نہیں بلکہ وہ ہمارے لئے حفاظتی دیوار کی مانند بھی ہیں۔ چالیس لاکھ افراد کی دیوار کو روندتے ہوئے کسی کے لئے ممکن نہیں ہے کہ ببرک کارمل یا روس کے ٹینک پر بیٹھ کر ان انسانی دیواروں کو عبور کر سکے۔ ایسے حملہ آوروں کی سرکوبی کے لئے ان کا حصار ابتدائی فصیل کے طور پر بہت کافی ہے۔

تو یہ ہیں افغان مہاجرین جو افغانستان سے آئے ہیں اور ہماری سرحدوں پر پہرہ دے رہے ہیں۔ بہت دنوں سے میری خواہش تھی کہ ان کے کیمپوں کا دورہ کروں۔ میرے سامنے دور دراز ملکوں کے اخباری نمائندے آئے، ان کیمپوں میں گئے جو خیمہ بستیاں کہلاتے ہیں اور اپنے اپنے اخباروں کے لئے بہت سا مواد، بہت سی کہانیاں اور بہت سے سنسنی خیز واقعات بنا کر لے گئے۔ مولانا غلام حقانی جو اس سرحدی علاقے کی خیمہ بستیوں میں خدمت خلق اور تبلیغ اسلام کا کام اول روز سے کر رہے ہیں، پچھلے دنوں لاہور تشریف لائے تو ہم نے ان کی زبانی ان افغان مہاجرین کی بہت سی دردناک کہانیاں سنیں۔ ان کے رنج و درد، ان کی مظلومیت اور بے سروسامانی اور پھر ان کی عزیمت کے واقعات سنے تو میرے دل میں ان سے ملنے اور ان کے حالات جاننے اور ان کے دکھ میں شریک ہونے کا جذبہ پیدا ہوا۔

میں نے قاضی حسین احمد صاحب سے جا کر اپنے اس خیال کا ذکر کیا جو اول روز سے مہاجرین کی پناہ اور مجاہدین کے جہاد میں بیک وقت دلچسپی اور جوش و جذبہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے بھی میرے اس خیال کی تائید کی۔
کہنے لگے "گیلانی صاحب جب تک خود جا کر نہ دیکھیں ان کے مصائب کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا اور نہ ان کی عزیمت اور صبر کا پہلو سامنے آتا ہے۔"

"میں نے مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے ہوئے مہاجرین کے کیمپوں میں ۱۹۴۷ء میں امدادی کام کیا تھا۔ مجھے اس دکھ درد کا احساس ہے، جب مشرقی پنجاب سے لٹے پٹے اور زخمی قافلے پاکستان میں آتے تھے۔ میں نے اس زمانے میں والٹن کیمپ میں چند دن کام کیا تھا۔ یہ سرحدی علی احمد خان کیمپ میں آئے تھے۔ اور کی پناہ گزین جن کے بچے ... کر دئے گئے تھے۔ بچے جن کے والدین ہو گئے تھے اور وہ بوڑھے جن کے جوان بیٹے سکھوں کی تلوار

سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

قاضی صاحب نے کہا "ٹھیک ہے آپ کو اندازہ ہے۔ یہ بھی ویسے ہی مہاجر ہی ہیں۔ وہاں پاکستان کے ذمہ دار لوگ جا کر ان کا حال پوچھیں تو انھیں اطمینان ہوتا ہے کہ یہاں کے مسلمان بھائی ان کے دکھ درد میں شریک ہیں۔ انھیں حوصلہ ہوتا ہے ویسے تو وہ بیچارے بڑے صابر ہیں۔"

"میں انشاء اللہ ضرور جاؤں گا۔ اپنے بھائیوں کے دکھ درد میں شریک ہونا ہمارا ایمانی فریضہ ہے۔" میں نے کہا اور چند دن بعد ہی ہم چند آدمی تیار ہو گئے۔

پشاور میں ہم مدرسہ احیاء العلوم کے مہمان تھے اور مولانا غلام حقانی ہمارے میزبان تھے۔ مولانا غلام حقانی نے سید منظور حسین کی ڈیوٹی لگائی کہ ہمیں کیمپوں کا دورہ کروائیں جو ہم نے اٹک پار کرتے ہی کئی مقامات پر لاہور پشاور روڈ کے دونوں طرف دیکھے تھے۔ دور دور تک خیموں کی آبادیاں ہی آبادیاں تھیں۔ خیمے ہی خیمے۔ جیسے کسی فوج نے آ کر ڈیرہ ڈال دیا ہو۔ سفید سفید خیموں کے دور دور تک سلسلے تھے۔

دار العلوم کے مہمان خانے میں رات گزارنے کے بعد دوسرے دن ہم نکل کھڑے ہوئے۔ مولانا غلام حقانی نے ایک جیپ نما گاڑی کا انتظام کر دیا تھا اور سید منظور حسین کو ضروری ہدایات بھی دے دی تھیں۔ ہمارا گمان تھا کہ پشاور شہر افغان مہاجرین کی بھیڑ بھاڑ سے بھرا ہوا ہو گا لیکن ہم نے ایسا نہیں دیکھا۔ ہمارا خیال تھا کہ پشاور کے فٹ پاتھ ان کے اجڑے ہوئے قافلوں سے معمور ہوں گے لیکن ہم نے ایسا بھی نہیں پایا۔ ہمارا احساس تھا کہ پشاور کے گرد و نواح میں آدھی سے زیادہ تعداد ان مصیبت زدہ لوگوں کی ہو گی لیکن ہمارا یہ اندازہ بھی غلط نکلا۔ ہم نے اپنے پہلے دیکھے ہوئے شہر پشاور میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں دیکھی، وہی شہر تھا، اسی طرز کے اس کے گلی و بازار تھے۔ مجھے ۱۹۴۷ء میں مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے مہاجرین یاد آ گئے۔ ان کے آنے پر یہ سب کچھ تھا جس کا تصور میرے ذہن میں موجود تھا لیکن ان مہاجرین کے آنے پر یہ سب کچھ نہ تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مہاجرین پاکستان میں اپنے ملک کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے اور اس میں داخل ہوتے ہی اس کے چپے چپے پر پھیلتے چلے گئے تھے اور یہ مہاجرین احساس رکھتے ہیں کہ وہ کسی اور ملک کے باشندے ہیں لیکن [illegible] یہاں سے آئے ہیں جو ان کا اپنا ملک نہیں ہے۔ اس لئے افغان مہاجرین اور مشرقی پنجاب کے مہاجرین کے طرز عمل میں بنیادی فرق موجود ہے۔

بات ختم ہوئی اور ہم علی الصبح ان افغان مہاجر کیمپوں کی طرف روانہ ہو گئے جو اس علاقے میں خیمہ بستیاں کہلاتے ہیں

ناصر باغ کا کیمپ سب سے بڑا تھا۔ اس میں ایک لاکھ سے زائد آبادی تھی۔ یہ کیمپ ایک ترتیب و سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ ایک ایک خاندان کو ایک ایک خیمہ دیا گیا تھا جیسے ترتیب اور تنظیم سے قطاروں میں لگے ہوئے تھے۔ ہم نے بیشتر لوگوں کو اپنے اپنے خیموں میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ عورتیں اور بچے خیموں کے اندر تھے۔ مرد مختلف کاموں میں آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔ غلاظت اور گندگی کا نام و نشان نہیں تھا۔ صفائی ستھرائی کا اہتمام تھا۔ لوگوں نے کیمپوں میں ہی اپنی اپنی ضرورت کی چیزوں کی معمولی درجے کی چھوٹی چھوٹی دکانیں کھول رکھی تھیں۔

ان بستیوں میں جگہ جگہ ان مہاجرین نے خود ہی مسجدیں بنا رکھی تھیں۔ ہر خیمہ بستی اپنی سب سے پہلے مسجد بناتی ہے۔ یہ مسجد بنانا ان کے لحاظ سے زیادہ آسان اور اولین کام ہوتا ہے کہ گارے سے چھوٹی چھوٹی دیواریں کھڑی کر لینا اور پھر ان مٹی کی چھوٹی دیواروں کے سہارے چٹائی کی بڑی دیواریں کھڑی کر کے ان پر چٹائی یا گھاس کی چھت ڈال لینا۔ ایسی مسجدیں وہ ایک دو دن میں تعمیر کر لیتے ہیں۔ پھر یہی مسجدیں ان کے لئے نمازوں کی جگہ، دارالندوہ اور بچوں کے مکتب کا کام بھی دیتی ہیں اور جب بھی کوئی ان سے ملنے یا حالات معلوم کرنے آئے تو ان کی جلسہ گاہ کا کام بھی یہی مسجدیں دیتی ہیں۔

ہم ایک مسجد میں گئے جہاں ایک مولوی صاحب بچوں کو ناظرہ قرآن پڑھا رہے تھے۔ ہمارے جانے پر وہ مولوی صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ مولوی صاحب معمولی درجہ کی ٹوٹی پھوٹی اردو بول سکتے تھے اور ہماری بات آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ جنوبی ایشیا کے تمام مسلم ممالک میں علمائے کرام اردو کسی نہ کسی حد تک سمجھ لیتے ہیں۔ غالباً یہ دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ فیضان کا نتیجہ ہے کہ اس پورے علاقے کے علمائے کرام کی بڑی تعداد اسی دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوتی چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ میں نے بنگلہ دیش میں دیکھا کہ وہاں کے علمائے کرام بھی اردو سمجھتے ہیں۔

"مولوی صاحب آپ بچوں کو کیا کچھ پڑھاتے ہیں؟" ہم نے سوال کیا۔

"قرآن مجید ناظرہ، پھر دین کی باتیں سمجھاتے ہیں۔" مولوی صاحب نے جواب دیا۔

"یہ بچے کون ہیں؟" میرے ساتھیوں نے پوچھا۔

"یہ سب افغان مہاجر بچے ہیں، ان میں سے بعض کے والدین نہیں ہیں۔" انھوں نے کہا۔

"ایسے یتیم بچوں کا کفیل اور سرپرست کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے دوسرے رشتہ دار اور قبیلے والے۔" مولوی صاحب نے کہا۔

"کیا ان کو کتابوں کی ضرورت نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تو صرف قرآن شریف پڑھتے ہیں، اس کی ضرورت ہے البتہ ہم کو دینی کتب درکار ہیں تاکہ ہم خود ان کا مطالعہ کر کے ان کو دین کی ابتدائی تعلیم دے سکیں۔" مولوی صاحب نے کہا۔

ان کے آس پاس دو تین قطاروں میں چھوٹے چھوٹے بچے جھوم جھوم کر قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔

"مولانا صاحب آپ کو کسی شے کی ضرورت ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"نہیں اللہ کا شکر ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

اس مسجد میں چٹائیوں اور دریوں کی جگہ گھاس بچھی ہوئی تھی۔ صرف امام مسجد کے لئے محراب میں ٹوٹا ہوا کھجور کا ایک مصلیٰ تھا۔ لوگ وضو بھی اپنے اپنے گھروں سے کر کے آتے تھے۔ مسجد آدھی کچی دیواروں کی بنی ہوئی تھی اور اس کے اوپر ستونوں پر لکڑیاں ڈال کر گھاس پھوس کی چھت ڈالی گئی تھی۔ بس پوری خیمہ بستی میں مسجد ہی ایک مکان نما عمارت تھی۔ باقی تاحد نگاہ خیمے ہی خیمے تھے جن میں سے ہر خیمہ ایک پورے خاندان کا گھر تھا۔

ہم مسجد سے نکل کر خیمہ بستی کے دوسرے طرف مختلف گوشوں کی طرف نکل گئے۔ خواتین اپنے اپنے خیموں میں اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھی کھانے پکانے یا سینے پرونے کا کام کر رہی تھیں۔ ہر طرف خاموشی تھی کوئی شور و غل اس پوری بستی میں نہ تھا۔ قبرستان جیسی خاموشی اس بستی میں تھی۔

کہیں کہیں بہت معمولی درجے کی بہت سی چھوٹی چھوٹی دکانیں بھی تھیں جن میں سگریٹ، ماچس، نسوار یا مٹی کا تیل تھا۔ یہ انھیں مہاجرین میں سے بعض لوگوں نے بنالی تھیں۔

پھر ہم ایک ڈسپنسری میں چلے گئے۔ اکثر لوگ جو سرکاری ڈسپنسری میں آتے تھے وہ بخار یا پیٹ کی بیماریوں میں مبتلا تھے۔ معمولی درجے کی گولیوں اور مکسچر وغیرہ سے کام چلایا جا رہا تھا۔ ان ڈسپنسریوں پر بعض جگہ انہی مہاجرین میں سے ڈاکٹر بھی تھے اور بعض پر پاکستانی ڈاکٹر تھے۔ جماعت اسلامی نے بھی اپنا اہتمام میں شفاخانے اور کلینک قائم کر رکھے تھے جن کو چلانے کا کام جماعت کے کارکن یا افغان مہاجرین میں سے باصلاحیت افراد سے لیا جا رہا تھا۔ بہرحال سرکاری ڈسپنسریوں کے علاوہ دوسرے قریب جہاں جماعت اسلامی کا کام نظر آیا، جماعت والوں کا کہنا تھا کہ ہم نے مختلف مقامات پر کیمپوں میں ساٹھ سے زائد چھوٹے

شفاخانے، ایک ہسپتال اور کچھ چھوٹے شفاخانے بنا رکھے ہیں جن سے دن رات افغان مہاجرین استفادہ کرتے ہیں۔ اس طرح جس نوعیت کا مکتب ہم نے مسجد میں دیکھا تھا اس نوعیت کے چار سو سے زائد مکتب جماعت اسلامی نے چلا رکھے ہیں جن میں بچوں کو ناظرہ قرآن مجید اور دین کی ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے کارکن پاکستان کے وسیع بارڈر پر سینکڑوں میلوں میں پھیلے ہوئے ان کیمپوں میں خدمت انسانیت کا یہ کام کر رہے ہیں۔ افسوس کا مقام یہ نظر آتا ہے کہ خدمت خلق کی اس وسیع اور عظیم ضرورت کے موقع پر پختونوں کے بہی خواہ اور ان کی قومیت کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے والے حضرات ہمیں کہیں بھی نظر نہ آئے ہمارا خیال تھا کہ جماعت اسلامی والوں کی طرح ان کا بھی کوئی نہ کوئی کیمپ موجود ہوگا جو پختونوں کی اس مصیبت کے وقت ان کی خدمت کا کام کر رہا ہوگا۔ افسوس کہ ہاتھی کے دکھانے کے اور کھانے کے دانتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

ہم ایک ایسے کیمپ میں بھی گئے جہاں نوجوان ورزش پریڈ اور نشانہ بازی کی مشق میں مصروف تھے۔ ہمیں ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ نوجوان بیکار وقت گزارنے کے بجائے اپنا کچھ وقت مکتبوں میں تعلیم حاصل کرنے پر صرف کرتے ہیں اور کچھ وقت ان ورزشی کیمپوں میں کھیل کود، پریڈ اور نشانہ بازی پر صرف کرتے ہیں۔ یہ پہلو میرے لئے بڑا ہی خوش کن اور مثبت تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۷ء میں مشرقی پنجاب سے ہجرت کرکے آنے والے مہاجرین کے کیمپوں میں بالعموم گپ شپ، تاش اور شطرنج کی بازیاں چلتی تھیں۔ افغان مہاجر کیمپوں میں مجاہدانہ اسپرٹ اور صبر و شکر کی کیفیت زیادہ نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ہم ان نوجوانوں سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔ انھوں نے اپنی لائبریری بھی بنائی ہوئی تھی جس میں پشتو، فارسی اور دینی کتب موجود تھیں۔ انھوں نے زیادہ تعلیم یافتہ ساتھیوں کی مدد سے کچھ اعلیٰ تعلیم کی کلاسیں بھی بنا رکھی تھیں جن میں قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ، جغرافیہ، انگریزی اور حساب کتاب بھی سیکھتے تھے۔ یہ کلاسیں بہت مفید تھیں اور یہ سارا کام وہ خود ہی اپنے انتظام اور اپنے آدمیوں کی معرفت چلا رہے تھے۔ یہ تعمیری کام دیکھ کر مجھے بہت مسرت ہوئی اور محسوس ہوا کہ ان لوگوں میں تعمیری جذبہ موجود تھا۔ انھوں نے ہجرت کو بے کاری کے اشغال میں ضائع کرنے کی بجائے مفید کاموں میں اس فرصت کو صرف کرنے کا انتظام کر رکھا تھا۔

وہاں سے نکل کر ہم دو تین قریبی کیمپوں میں گئے۔ ہر جگہ یکساں ماحول، یکساں حالات اور یکساں

مصروفیات تھیں۔ نماز ظہر اور عصر ہم نے انھیں بستیوں کی مساجد میں ادا کیں۔ نماز عصر کے بعد ہم لوگ مہاجرین کے لیڈروں سے ملنے کے لئے گئے۔ ہماری ملاقات ان کے مختلف گروہوں کے لیڈروں سے ہوئی۔ بلاشبہ ان سے ملاقات کرکے ہمارے اندر جذبۂ جہاد بیدار ہوا اور ہمیں یہ احساس ہوا کہ بدترین حالات میں بھی حوصلہ کس طرح برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ ہماری ملاقات مولانا محمد یونس، انجینیر حکمت یار اور استاد عبدالرسول سیاف سے ہوئی۔ ان کے ساتھ ہم نے چائے پی۔ وہ ہمیں مل کر بے حد خوش ہوئے اور کہا:

"ہمارے لئے یہ بڑی حوصلہ افزائی کی بات ہے کہ پاکستان کے معزز شہری جو ہماری دامے درمے قدمے سخنے امداد کر رہے ہیں کبھی خود چل کر ہمارے کیمپوں میں آئیں اور ہماری حالت دیکھیں۔"

یہ بات استاد عبدالرسول سیاف نے کہی۔

"یہ بات اگر ہمارے علم میں ہوتی تو ہم اس سے پہلے ہی آئے ہوتے" میں نے کہا۔

"دیکھئے دنیا بھر سے اخباری نمائندے، یو این او کے مبصرین، مغربی ملکوں کے سفراء اور صحافی آتے ہیں اور ہم سے ملتے ہیں اور ہمارے عزائم معلوم کرتے ہیں جبکہ ہم ان کے ملک میں نہیں آئے ہیں لیکن جن کے ملک میں ہم نے اس مصیبت میں آکر عارضی ڈیرہ لگایا ہے وہ ہمیں پوچھنے بھی نہ آئے تو اس پر دکھ ہوتا ہے ورنہ ہم تو ان کے شکر گزار ہیں کہ وہ ہمارے بھائی ہیں اور ہمارے لئے جو سامان ان کے بس میں ہوتا ہے جمع کرکے ارسال کرتے ہیں" مولوی محمد یونس خالص نے کہا۔

"ہمیں معلوم ہے کہ آپ ہمارے لئے بہت کوشش اور محنت کر رہے ہیں" انجینیر حکمت یار نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اللہ تعالیٰ ہی آپ کو اس کا اجر دے سکتا ہے" انھوں نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔

"کیا آپ کے عزیزوں اور دوستوں میں سے بعض لوگ جہاد بھی کر رہے ہیں" ہم نے پوچھا۔

"کیوں نہیں ہم آخر ٹھنڈے پیٹوں کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے گھروں کو مسمار کر دیا ہے۔ ہمارے کھیتوں کو ویران کر دیا ہے، ہماری بستیوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے، ہمارے بچوں کو یتیم، ہماری عورتوں کو بیوہ اور ہمارے جوانوں کو بے گھر کر دیا ہے۔ وہ تاک تاک کر ہماری مسجدوں کو نشانہ بناتے ہیں، انھوں نے عین حالت نماز میں بمباری کرکے ہماری مساجد اور نمازیوں کو شہید کر دیا اور وہ ہماری عورتوں کو بے آبرو کرنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ ساری باتیں کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ ہم ان کی سپر پاور کی قلعی اپنے

جو قوتیں ہمیں مسل دیں گے۔ ہم ان کے ناپاک وجود کو اپنے وطن میں نہیں رہنے دیں گے۔" استاد سیاف نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"کیا جہادیوں کے تمام گروہوں میں اتحاد موجود ہے؟ اور وہ کسی متحدہ تنظیم کو قبول کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بھی اور نہیں بھی۔ اس بات پر ہم سب متحد ہیں کہ دشمنوں سے ملک کو خالی کرانا ہے اور اپنی آزادی، عزت اور ایمان کے بدلے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا ہے۔ لیکن جہاں تک باہمی جنگی اتحاد کا تعلق ہے اس کی ضرورت نہیں ہے جب سب کو گوریلا جنگیں کرنی ہیں تو پھر ہمیں وسیع پیمانے پر کسی متحدہ محاذ یا کمانڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ایک فوج بنا کر نہیں لڑ رہے ہیں۔ ہمارے سب تنہا فوجیں ہیں۔ ان کا دشمن ایک ہے ان سب فوجوں کے محاذ مختلف ہیں۔" انجینئر حکمت یار نے کہا۔

"ٹھیک ہے سیکڑوں میلوں میں پھیلے ہوئے محاذ کے لیے کسی ایک کمانڈ کی ضرورت بھی نہیں ہے اور یہ ممکن بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

اتنے میں چائے آگئی اور ہم لوگ افغان مہاجرین کے کیمپوں کی چائے پینے لگے۔

اسی دوران استاد عبدالرسول سیاف اپنے تعلیمی دور کی اسلامی تحریک کی کہانی سنانے لگے۔ میں نے پوچھا۔

"کمیونسٹوں کو آپ کے قدیم اسلامی ملک میں گھسنے کا موقع کس دور میں ملا؟"

"ظاہر شاہ نے یہ موقع فراہم کیا۔" انھوں نے کہا۔

"وہ خود تو سوشلسٹ نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ سوشلسٹ تو نہیں البتہ موقع پرست اور مفاد پرست تھا۔ اس مفاد پرستی میں وہ ملک اور اسلام دونوں کو داؤ پر لگائے ہوئے تھا۔ اسے جب ہوش آیا تو پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔" گلبدین حکمت یار نے کہا۔

"یہ جو گزشتہ دنوں بعض مغربی پریس کی طرف سے ظاہر شاہ کی جدوجہد آزادی میں شرکت اور افغانستان میں کسی مصالحتی فارمولے کی طرف آنے کی خبر چھپتی رہتی ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔ وہ بھی کبھی کبھی یوں بیان دیتا ہے جیسے اس کا تعلق وطن کی آزادی اور تحریک آزادی دونوں کے ساتھ بہت گہرا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"یہ سب مغربی قوموں کی فریب کاری ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ افغانستان میں اسلامی تحریک کو ایک طرف کر کے روس سے لادینیت کو برسرِ اقتدار لانے کا سودا کریں لیکن چونکہ وہ اصل فریق اور مردِ میدان نہیں ہیں اس لیے ایسی خبریں چھپوا کر بیٹھ جاتے ہیں۔" استاد سیاف نے کہا۔

"ہم ایک ہی شرط رکھتے ہیں روس کی فوجوں کی واپسی اور اسلامی حکومت کا قیام۔" مولوی محمد یونس خالص نے کہا۔

"یہ بات تو شاید مغرب کو بھی معلوم نہیں ہے۔" منظور صاحب نے کہا۔

"ظاہر ہے کہ مغرب اسلامی نظام حیات کیسے قبول کر سکتا ہے، وہ پُرشوکت اور غالب اسلام دیکھنے سے خائف ہے۔" پروفیسر سیاف نے کہا۔

"کیا آپ کے کیمپوں میں روسی یا کابل کی خفیہ پولیس کے آدمیوں کے گھسنے کا خطرہ تو نہیں ہے۔ اس لیے کہ روس کی خفیہ ایجنسیاں تو دنیا بھر میں مشہور ہیں خصوصاً کے جی بی کے ایجنٹوں سے آپ کس طرح محفوظ رہتے ہیں جبکہ روس ہمیشہ قوموں کے اندر سے ہی اپنے لیے غدار اور ایجنٹ پیدا کرتا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"یہ سب لوگ قبیلہ وار خیمہ بستیوں میں رہ رہے ہیں اور ایک دوسرے کو خوب جانتے پہچانتے ہیں۔ ان کے اندر کوئی آدمی چھپ نہیں سکتا۔" مولوی خالص نے کہا۔

"تخریب کاری کرنے والے تو کئی روپ بدل لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

استاد حکمت یار نے مسکرا کر کہا "کیا آپ نے یہ شعر سنا ہے کہ

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

ہم ان کے سب حربوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ ایسے لوگ ہم نے پکڑے بھی ہیں اور پھر ان کی ایک ہی سزا ہوتی ہے جو ہم دنیا خوب جانتے ہیں۔" مولوی محمد یونس خالص نے کہا۔

"عالم اسلام کی طرف سے آپ کو کیا کچھ مدد مل رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

میرے اس سوال پر ان کے چہرے اتر گئے اور وہ جیسے خلا میں گھورنے لگے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے ان کو رنجیدہ کر دیا ہے۔ مجھے اپنے اس سوال پر افسوس ہونے لگا۔

میں نے کہا "میرا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ کو کچھ بہت زیادہ دشواریوں سے سابقہ تو نہیں ہے؟"

میری اس بات پر استاد سیاف مسکرائے اور کہنے لگے "دو سال پہلے مجھے یہ موقع ملا تھا کہ اسلامی سربراہی کانفرنس مکہ مکرمہ میں عالم اسلام کے سربراہوں کے سامنے افغانی قوم کا دکھ درد بیان کروں۔ آخر عالم اسلام بانجھ تو نہیں ہے اللہ کا فضل ہے بے سروسامان نہیں ہے۔ اس کی آبادی ساری دنیا کی ہر قوم سے زیادہ ہے۔ اس کی دینی قوت بھی اسلحہ پر جرأت ہے سب کچھ ہے لیکن کیا کہوں کہ میں نے جو کچھ کہا اس کا وہاں کیا کچھ اثر ہوا۔ ویسے تو ہر شخص متاثر نظر آتا تھا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا ہے۔ کوئی بھی قدم تو کسی نے بھی نہیں اٹھایا بس ہم تو صحرا میں پکار کر آگئے ہیں۔ ہماری پکار صحرا کی اذان بن گئی۔"

"آپ کی توقعات عالم اسلام سے کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہم ایک ملت اسلامیہ ہیں۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ مسلمان جسد واحد کی مانند ہیں۔ ایک کو دکھ ہوتا ہے تو دوسرا بے چین ہوتا ہے۔ ہم تو حیران ہیں کہ جو روس ہماری نسل کشی کر رہا ہے اس کے ساتھ تمام مسلمان ملکوں کے دوستانہ تعلقات ہیں۔ بعض اپنے مسائل کے لئے دوڑ دوڑ کر اس کے پاس جاتے ہیں کیا یہ لوگ اس کا سفارتی مقاطعہ بھی نہیں کر سکتے ہیں۔" استاد سیاف نے توقف کیا۔

"اگر مسلمان ممالک ایک بار ہمت کر کے اعلان کر دیں کہ جب تک افغانستان میں روسی فوجیں موجود ہیں ہم روس سے سفارتی تعلقات ختم کرتے ہیں اور اس سے تجارتی لین دین بند کرتے ہیں تو ہمیں یقین ہے کہ یہ سفید ریچھ ہمیں چھوڑ کر واپس جا سکتا ہے۔" مولوی محمد یونس خالص نے کہا۔

"اگر مسلمان ممالک نے اس بارے میں کوئی جرأت مندانہ اقدام نہ کیا تو روس ایک ایک مسلمان ملک کو باری باری کر کے ہڑپ کرتا جائے گا۔ وہ اتنی مزاحمت بھی نہیں کر سکیں گے جس قدر ہم کر رہے ہیں۔" استاد حکمت یار نے کہا۔

"یو این او میں تو بہر حال افغانستان کے حق میں اور روس کی مذمت میں قرارداد پاس ہوتی ہے" میں نے کہا۔

"قراردادوں سے کیا ہوتا ہے۔ قرارداد مذمت سے کسی بے شرم ظالم قوت کو کیا زخم آ سکتا ہے۔ ظالم کا علاج صرف یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑا جائے" مولوی محمد یونس خالص نے کہا۔

"ظالم کا ہاتھ اس دور میں کون پکڑے" میں نے کہا۔

"امت مسلمہ پکڑے جو اس کام پر مامور ہونے کے سبب امت مسلمہ کہلاتی ہے" استاد سیاف نے کہا۔

"امت مسلمہ کے ہزار ٹکڑے ہو چکے ہیں اور ہر ٹکڑا دوسرے سے متصادم ہے" میں نے کہا۔

"اس افتراق کا علاج بھی جہاد ہے۔ ہمارے اختلافات ختم کرنے کا واحد راستہ جہاد ہے۔ جہاد ہی امت مسلمہ کے تمام امراض کا واحد مداوا ہے۔" استاد حکمت یار نے کہا۔

"یہ دوا بہت کڑوی ہے۔ مریض میٹھی دوا کا عادی ہو گیا ہے۔ کڑوی دوا سے بھاگنے کی وجہ سے ہی تو اب تک بیمار چلا آ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر ہمارا اللہ ہی حافظ ہے۔" تینوں نے کہا۔

کچھ توقف کے بعد ہم نے ان سے اجازت طلب کی وہ انتہائی انکساری اور محبت کے ساتھ ہمیں چند قدم تک پہنچانے کے لئے ہمارے ساتھ آئے۔ ہم ان سے جدا ہوئے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دیرینہ ساتھیوں اور پر محبت بھائیوں سے جدا ہو رہا ہوں۔

ان سے ملنے کے بعد ہم ایک اور کیمپ مہاجر کیمپ کو دیکھنے کے لئے گئے۔ یہ ناصر باغ سے کچھ فاصلے پر تھا مغرب کی نماز ہم نے اس کیمپ کی گھاس پھوس کی بنی ہوئی مہاجر مسجد میں جا کر ادا کی۔ اس مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے مجھے مشرقی پنجاب سے لاکھوں مسلمانوں کی ہجرت کا سماں یاد آ گیا۔ لاکھوں مسلمان ہندو سکھوں کے مظالم کا شکار ہو کر مشرقی پنجاب سے اجڑ کر مغربی پنجاب میں آئے تھے تو اسی طرح شہر شہر میں مہاجرین کے کیمپ لگ گئے تھے۔ اس وقت نیا نیا پاکستان بنا تھا۔ اور مسلمانوں میں پاکستان کے اسلامی کردار کے بارے میں بہت سی امیدیں تازہ تھیں۔ لوگ ان دکھوں کو ہنسی خوشی برداشت کر رہے تھے۔ اسلامی نظام کے بارے میں ان کی امیدیں تازہ تھیں۔ وہ سارے دکھ برداشت کرنے کو اجر کا باعث سمجھتے تھے۔ ۴۰ سال قبل اس ملک کے لئے لوگوں نے کیسی کیسی قربانیاں دی تھیں اور یہ ملک آج تک اسلام سے محروم تھا۔ اس میں عوام کا کوئی قصور نہ تھا۔ سارا قصور حکمرانوں اور علمائے کرام کا تھا۔ حکمران اور علمائے کرام دونوں نے اس قوم کو متحد ہو کر کسی ایک پلیٹ فارم پر آنے دیا اور نہ ہی ان کے اندر ملی آرزوؤں کو بیدار کرنے اور ان کے لئے جد و جہد کرنے کی تڑپ پیدا کی۔ فی الحقیقت مسلمان قوم دنیا بھر میں اپنے حکمرانوں کی کشتہ ہے اور اپنے علماء اور امراء کی ستم ظریفیوں کا شکار ہے۔ اس کا دل مسلمان ہے۔ اس کے ذہن کو خراب کرنے کا کام حکمران اور علمائے کرام کرتے رہتے ہیں۔

نماز کے بعد سید منظور حسین صاحب نے پشتو میں نمازیوں کو ہماری آمد کے مقصد سے آگاہ کیا تو بہت سے نمازی ہمارے [illegible] گرد جمع ہو گئے۔

وہ پشتو میں کہہ رہے تھے "بھائی! ہم آپکے ممنون ہیں کہ آپ ہمیں سامان، دوا، روپیہ ارسال کرتے ہیں لیکن ہمارا حقیقی سامان اور ہماری اصل دوا اسلحہ ہے۔ اگر ہمیں اسلحہ دے تو ہم ان ناپاک روسیوں کے ناپاک وجود سے اپنے وطن کو پاک کردیں اور ہم اپنے وطن کو واپس چلے جائیں۔"

ہم نے کہا "اسلحہ تو عالم اسلام ہی دے سکتا ہے، حکومتیں دے سکتی ہیں ہم تو آپکے خادم اور میزبان ہیں جو ہمارے بس میں ہے بس وہی کچھ ہم دے سکتے ہیں۔"

ہماری اس بات پر بعض بزرگ مہاجرین کی آنکھیں نم ہوگئیں اور وہ یاس بھری نظروں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

"اللہ ہم سب کا مالک ہے جو ابابیلوں سے لشکروں کو مروا دیتا ہے۔ اسی سے امید وابستہ کرنا ہمارا فرض ہے۔" میں نے کہا۔

"بے شک بے شک" چند آوازیں آئیں۔

پھر وہ ہمیں اپنے ساتھ چل کر قہوہ پینے کے لئے تقاضا کرنے لگے لیکن منظور صاحب نے بتایا کہ ہم صبح سے مختلف کیمپوں میں گردش کرتے چلے آرہے ہیں اب ہم واپس جانا چاہتے ہیں۔

بہت سے محبت بھرے معانقوں کے بعد ہم اس کیمپ سے رخصت ہوئے۔ راستے میں ہم نے مہاجر اور مظلوم مسلمانوں کے بچوں، عورتوں، بوڑھوں، بیماروں، پریشان حال لوگوں کو پھٹے پرانے خیموں میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ غم و آلام کی تصویریں، محرومی و مظلومی کی تصویریں، دکھ درد کی تصویریں اور کمیونزم کی درندگی کی زخمی اور دریدہ تصویریں، یہ خیمہ بستیاں ہیں، یہ کمیونزم کی فتوحات کے عجائب گھر ہیں جن کو مارکس، لینن اور سٹالن کو سمجھنا ہو وہ ان خیمہ بستیوں کا دورہ کرے، سارا کمیونزم یہاں کھلا پڑا ہے، یہ کمیونزم کے مظلوموں اور محروموں کا فتح کا نشان ہے۔ یہ آگے بڑھتی ہوئی انسانیت کا لاؤ لشکر ہے یہ مظلوم انسانیت کی حمایت کا مدعی کمیونزم کا میدان فتح ہے، یہ لاکھوں مظلوم کمیونزم کا شکار ہیں۔ ان کو روٹی کپڑا اور مکان، خیمہ بستی اور وطن، دکان، کھیت اور کھلیان ہر چیز سے محروم کرکے کمیونزم نے بے چارگی کے جوہڑ میں پھینک دیا ہے، کمیونزم کی برکات کا خونیں چمن ان بستیوں میں کھلا ہوا ہے، اس چمن کا ہر پھول زخمی اور دریدہ ہے۔

افغانستان کو کمیونزم نے اپنی حقانیت اور انسان دوستی کا جو سبق دیا ہے اس سبق کو افغانوں کی آئندہ نسلیں بھی فراموش نہ کرسکیں گی۔ روس اور کمیونزم کی امن پسندی، انسان پروری اور عوام دوستی دنیا کے

جو اب پر عریاں ہوکر خوفناک تباہی کا ناچ ناچ رہی ہے اور اسی ناچ میں افغانستان کے غریب عوام دانوں کی طرح بھن رہے ہیں۔

افغان مہاجرین کے کیمپوں میں جاکر ان کی حالت زار کو دیکھکر خواہ مخواہ "کمیونزم زندہ باد" کا نعرہ لگانے کو جی چاہتا ہے۔ جس قدر ان کیمپوں کو دیکھکر کمیونزم اور روس کی حقیقت واضح ہوتی ہے اس کی کتابیں پڑھکر اور اس کی ہمہ گیر فتوحات کے کارنامے سنکر وہ حقیقت واضح نہیں ہوتی۔

وہ رات ہم نے ادارہ احیاء العلوم کے مہمان خانے میں بڑے اضطراب میں گزاردی۔ اتنی روحانی اذیت مجھے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی اس وقت بھی نہ ہوئی تھی جب میں خود مہاجر بن کر مشرقی پنجاب سے ۱۹۴۷ء کے اکتوبر میں پاکستان آیا تھا اور واہگہ کے بارڈر پر پاکستان کی حد میں داخل ہوکر کھلی سڑک پر بستر کے بغیر لیٹ کر سوگیا تھا۔ چونکہ ہم جالندھر سے صبح سات بجے روانہ ہوکر بس کی چھت پر بیس گھنٹے کا سفر کرکے صبح تین بجے پاکستان میں داخل ہوئے تھے، ہمارا بدن زخمی اور چور چور تھا لیکن پاکستان اپنے خوابوں کی سرزمین میں داخل ہوکر ہماری تکان اتر گئی اور سارے دکھ درد ختم ہوگئے تھے۔ پاکستان ہمارا گھر تھا اور ہم گھر میں آگئے تھے، ہم نے پردیس سے وطن کی طرف ہجرت کی تھی۔

لیکن افغان مہاجرین کی ہجرت طویل اور لامتناہی تھی۔ وہ وطن سے پردیس کی طرف ہجرت کرکے آئے تھے اور یہاں ایک نہ ختم ہونے والے انتظار میں بیٹھے تھے۔ آج ان کا انتظار عالم اسلام کی طرف سے امداد کا انتظار ہے۔ دنیائے انسانیت کی طرف سے تعاون کا انتظار ہے۔ اپنے مجاہدین کی طرف سے دشمن انسانیت سے وطن خالی کرالینے کا انتظار ہے۔ خدا کی طرف سے غیبی امداد کا انتظار ہے۔ انتظار ایک لامتناہی انتظار۔ اس انتظار کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ یہ انتظار صبر و قناعت سے محبت اور جرأت و بہادری سے ہی کاٹا جاسکتا ہے اور ہر انتظار کے آخری مرحلے پر امیدیں اللہ تعالیٰ سے ہی وابستہ ہوتی ہیں۔

ایک بوجھل دل، بوجھل ذہن اور بوجھل احساسات کے ساتھ ہم ان کیمپوں سے واپس آئے۔ یا اللہ تو ہی مدد فرمانے والا ہے، ان کے گھروں کو، وطن کو عزت و آبرو کو، ملت کے افراد کو درندہ صفت دشمن کے ظلم و ستم سے بچانے والا ہے تیرے ہی دربار میں ہم فریاد کرتے ہیں۔ اپنے دکھوں کے لئے اپنی غلطیوں کوتاہیوں اور گناہوں کے لئے تیری ہی جانب ہم توبہ اور استغفار کرتے ہیں اور تیرے ہی دامن کو تھامتے اور تیرا ہی سہارا پکڑتے ہیں۔ اے اللہ! ان مظلوم بندوں پر رحم فرما اور انھیں اپنے گھروں میں واپس جانے کا سامان پیدا کردے۔

دوسرے روز ہم واپس لاہور آ گئے۔ میرے دل و دماغ میں الم گزیدہ خیالات کا طوفان تھا اور روس کے خلاف نفرت کا ایک لاوا تھا جو ابل رہا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد ہم نے کوئٹہ میں مہاجرین کے کیمپ دیکھنے کا فیصلہ کیا اور خان عبدالمجید خان سے مراسلت کر کے وہاں پہنچ گئے۔ اس دفعہ جب سرخاب افغان مہاجر کیمپ میں ہم عصر کے وقت پہنچے تو میرے ساتھ خان عبدالمجید خان اور اشفاق مرزا تھے۔ چند دوسرے مہاجر ساتھی بھی ہمراہ تھے جو کوئٹہ سے ہی ہمارے ساتھ آئے تھے۔

ایک خشک برساتی نالے کے دونوں اطراف میں سرخاب افغان مہاجرین کیمپ آباد تھا۔ خان صاحب نے بتایا کہ اس کیمپ کی آبادی ایک لاکھ نفوس کے لگ بھگ ہے۔ یہ کیمپ یہاں بہت پرانا ہے یعنی افغان میں روسی حملے کے بعد جو لوگ افغانستان سے ہجرت کر کے آئے۔ اس کیمپ کی بیشتر آبادی انھیں مہاجرین پر مشتمل ہے۔

اس کیمپ میں پرانی آبادیوں کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اس میں ایک چھوٹا سا بازار بھی تھا جس میں چھوٹی چھوٹی چیزیں سبزی، گوشت اور نمک مرچ دال کی دکانیں تھیں۔ سوختنی لکڑیوں کے ٹال بھی تھے اور لوگ ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ سب سے پہلے ہم نے مسجد کو تلاش کیا اس لئے کہ نماز عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ دفعتاً ہم نے ایک مسجد سے اذان کی آواز سنی اور ہم اس طرف مڑ گئے۔ مسجد کیا تھی گارے کا ایک کچا سا مکان تھا جس میں ٹوٹی پھوٹی خستہ کھجور کی کافی چٹائیاں پڑی تھیں۔ سوختنی لکڑیاں ڈال کر چھت پر گھاس پھوس ڈال دی گئی تھی۔ سردی سے سارا ماحول ٹھٹھر رہا تھا۔ لیکن نمازیوں کی تعداد کافی تھی۔ پیش امام جنھوں نے نماز پڑھائی ان کی کھدر کی میلی چادر، پھٹی ہوئی قمیص اور کمزور جسم کے ساتھ ناکافی لباس دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے نماز کے بعد اپنی جیب سے کچھ نکال کر ہدیۃً دے دی۔ انھوں نے محبت اور شفقت کے جذبات کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ پھر اشفاق مرزا نے مسجد کی چٹائیوں کے لئے کچھ رقم دی اور ہم ان کی طرف سے قہوہ پینے کی دعوت پر معذرت کرتے ہوئے مسجد سے باہر آ گئے۔

یہ خانماں برباد بھی عجیب مہمان نواز لوگ ہیں۔ خود خستہ حالی میں مبتلا ہیں۔ پریشانی اور افلاس ان کے چہروں سے نمایاں ہے۔ بے سروسامانی ان کے ہر طرف دکھائی دیتی ہے لیکن وہ اجنبی مہمان کو دیکھ کر ضرور ہی چائے قہوہ اور کھانے میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ وہ ثقافت ہے جو اسلام نے انھیں سکھائی ہے۔ اسلامی آداب ان کے کردار میں بہت نمایاں محسوس ہوتے ہیں۔ •••

عبدالرحمٰن خالد

رضی الدین

حلقۂ یاراں

مکرمی ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم

حیات نو کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ دل خوش ہو گیا۔ حیات نو کا انداز، ترتیب، معیار، کتابت اور طباعت اپنی بلندیوں کو چھو رہی ہے۔ گجرات کے فسادات تاریخ انسانیت کے سیاہ ابواب ہیں۔ ان کو پڑھ کر انسانیت کانپ کانپ جاتی ہے۔ کیا ایک انسان کسی دوسرے انسان کو مار سکتا ہے؟ اس کا گھر پھونک سکتا ہے؟ اس کو بیوی بچوں سے الگ کر سکتا ہے؟ اس کو زندہ جلا سکتا ہے؟ ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ گجرات کی تاریخ اور احمد آباد کا حادثہ ہم کو یہی بتاتا ہے۔

برادر مکرم! شاید آپ کے علم میں یہ بات ہو کہ مدراس ہائیکورٹ نے کس طرح محمد پاشا انسپکٹر سیکورٹی فورس بھارت الیکٹرونکس لمیٹیڈ حیدر ولی کی درخواست کو رد کر دیا ہے اور کہا ہے کہ "مسلمانوں کیلئے داڑھی رکھنا دینی لحاظ سے ضروری نہیں ہے"

بی ایچ ای ایل کی جانب سے محمد پاشا پر پابندی لگائی گئی تھی کہ وہ داڑھی نہیں رکھ سکتا۔ اس نے عدالت میں درخواست دی اور عدالت نے اس طرح انصاف کیا۔ عدالت ہمارے ملک کا ایک اساسی شعبہ ہے جو قابل احترام ہے اور جس کے فیصلے نافذ ہوتے ہیں لیکن کیا اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ جج صاحبان دنیا کے تمام علوم و فنون کے ماہر ہوتے ہیں اور ہر شعبۂ علم کے لئے ان کی رائے حتمی اور قطعی ہوتی ہے؟ کم از کم میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی ہے کیونکہ جج بھی ہماری طرح انسان ہوتے ہیں۔ وہ جس طرح دنیا کا کوئی آدمی تمام علوم و فنون کا ماہر نہیں ہو سکتا ویسے ہی ان کو بھی نہیں ہونا چاہئے۔ مگر عدالت کی کرسی پر وہ اس طرح فیصلہ کرتے ہیں جیسے ہر علم میں ان کو امتیازات حاصل ہیں۔ اب داڑھی ہی کو لیجئے۔ اسلام میں داڑھی چاروں ائمہ کے نزدیک واجب ہے نیز ہمارے رسول مقبول ﷺ کی سنت اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طریقہ ہے۔ رسول ﷺ نے اس کو بڑھانے اور مونچھیں ترشوانے کا حکم دیا ہے اور پوری امت مسلمہ اس پر تواتر سے عمل کرتی آ رہی ہے سوائے اس دور کے چند ماڈرن مسلمانوں کے، بلکہ مسلمان تو اس شخص کے تقویٰ اور پاکیزگی کا اعتراف بھی

نہیں کرتے جس کے چہرے پر داڑھی نہ ہو چاہے وہ لاکھ قسمیں کھائے اور مستحق ہونے کا ثبوت فراہم کرے مگر یہ چیز جس جج صاحب کو نظر آئی، حکومت کو چاہئے کہ وہ تمام عدالتوں میں جو ہندوستان میں پائے جاتے ہیں تمام مذاہب کے چند باکمال علماء کو مقرر کرے جس پر ہر مذہب کے ماننے والے اعتماد کرتے ہوں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے کسی فیصلہ سے پہلے مسلم پرسنل لاء بورڈ سے مشورہ کو ججوں کے لئے لازم قرار دے، اس کے بغیر فیصلے یونہی ہوتے رہیں گے اور مسائل پیدا ہوتے رہیں گے۔

استاذ عمر تلمسانی ایک فرد ایک تحریک بہت عمدہ مضمون ہے، اقبال کی شاعری، اور قرآن کی ادبی خصوصیات بڑی محنت سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ تابش مہدی کا یہ شعر" اس سے ظالم کے قدم ہیں گے ہو جسے، پیر زخموں کو چھپائے جائیے۔ حفیظ میرٹھی کا یہ شعر" ستم کو وہ کرم ثابت کریں گے، ذہانت ان کو بخشی ہے خدا نے۔ اور عطا عابدی کا یہ شعر" جھلکتی ہیں مرے اجداد کی تابانیاں اس میں، کسی صورت ہم اپنی قوم کا پرچم نہ جھکنے دیں گے۔ نیز بدر عالم خاں ایم۔ اے کا یہ شعر" دیکھ لینا یہیں قاتل بھی کوئی ہوگا ضرور، صرف قاتل ہی چلا جیں خنجر دیکھو" بہت پسند آئے۔

خاکسار: محمد عبدالرحمان خالد، جامعۃ الفلاح

محترم جناب ایڈیٹر حیات نو! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حیات نو کا دن بدن معیاری ہونا بہت خوش آئند بات ہے۔ مجلہ کا موضوع خصوصاً تعلیم و تدریس ہونا چاہئے ایسا میرا احساس ہے۔

اقامت دین کی جدوجہد کے سلسلے میں دین کے تقاضے کو سمجھنا اور نیز رکھنا اور شکر سے اجتناب کرنے کے ساتھ اپنے حالات و ضروریات کے تحت اپنے سماج اور حکومت کے اداروں سے تعارض بھی کرنا ہوگا۔ ورنہ رائے عامہ کا ہموار ہونا فرد کی تعمیر اور معاشرے کا قیام اور بالآخر حکومت کی تشکیل کرنا گویا اپنے پیروں کو آزاد کر دیا پھر جگہ ذہن تبدیل کر لینا ہے۔ یہ تمام مراحل بغیر کسی تعارض کے ایک کے بعد ایک ترتیب کے ساتھ پیش آنا ایک نظری سکیم ہو جائے کہہ دیں لیکن عملی اسکیم نہیں بن سکتی ہے۔ فرد کی تعمیر اور معاشرے کے قیام کے مرحلے میں حکومتی اداروں سے ٹکراؤ کسی اور کسی طرح کا کوئی تعارض نہ کرنا سمجھ میں نہیں آتا تاکہ ان کو وہ مرحلے سے پوری طرح سے گذر جائیں۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ مغربی جمہوریت الحاد یعنی ایک کل فلسفۂ حیات ہے لیکن جبکہ ہم وہ آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کہیں کسی زمانہ میں بھی اپنی اصل شکل میں مکمل صورت میں قائم نہیں ہو سکا ہے ایسی صورت

میں خواہ مخواہ کھینچ تان کر کے اپنی رائے کا وزن بڑھانے کے لئے یہ کہنا کہ موجودہ جمہوری ادارے بے فلسفۂ حیات کی محض ترجمانی کرتے ہیں کہاں تک مناسب طرز عمل ہے۔ الیکشن میں شرکت یا ووٹ کے استعمال سے فیصلہ کن نتیجہ حاصل کرنے کے سلسلے میں غور و فکر کرتے ہوئے ہمارا یہ طرز فکر ہوا کرتا ہے کہ یہ اقدام رائے عامہ کے ہموار کرنے کے بعد کا ہے جبکہ الیکشن کے ذریعہ ووٹ ہیو و دٹ اور ایجنڈہ کا مطلب رائے عامہ کا حصول ہے نہ کہ رائے عامہ کے ہموار کرنے کے بعد صرف حکومت کی تشکیل کرنا ہے، ہمارے یہاں الیکشن کے ذریعہ رائے عامہ کا ہموار کرنا اور حکومت کی تشکیل کرنا دونوں ہی کام ایک ساتھ انجام پاتا ہے اور منتخب پارلیمان اپنے حکومت کے تشکیل کے بعد بھی کچھ قدروں کی بنیاد پر اپنی دیون کو بار بحث و ترمیم کا موضوع بنائی رہتی ہے وہ کبھی بھی اپنی اصل حیثیت میں انسانی قدروں سے الگ ہٹ کر کسی اقدام کی مجاز نہیں ہوتی ہے بلکہ انسانی قدروں کی پشت پناہی کے ذریعے اسلامی قدروں کی بحالی کے لئے اس میدان میں قدم رکھنے کی شدید ضرورت ہے اسی لئے الیکشن میں شرکت کی بات صرف انسانی ادارے کی حیثیت سے کہی جاتی ہے نہ کہ اس کے ایک مستقل فلسفیانہ وجود کو تسلیم کر کے کہی جاتی ہے۔

خلاف کی بنیاد "شرک فی الحاکمیت" ہے جو ایک نظری بحث ہے، اور عملی مسائل سے اس کا تعلق نہیں رکھتا ہے۔ تحریک کی ابتدا اس مسئلہ حاکمیت کی نظری بحث سے شروع کر کے بہت بڑی غلطی کی گئی ہے کیا انبیاء نے حاکمیت الٰہ کا نظریہ پیش کر کے اسلامی دعوت کی ابتدا کی یا یہ کہ تمام نبی نوع انسان کو اللہ کی طرف بلایا اور اس کی بندگی اختیار کرنے کی دعوت دی۔ ان کو آفاق و انفس کے دلائل کے ذریعہ جلوہ خود اللہ کی طرف بلایا اب کہیں جاکر ایسی صورت حال بن سکی جو کہ ہم صرف نظری بحث کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں کیا اسلامی دعوت کا مخاطب سماج من حیث الجماعت ہے یا فرد ہی اس دعوت کا مخاطب ہے اور وہ اسے قبول کر کے ایک دوسرے سماج میں تبدیلی ہوتا ہے لیکن جب ہم اس دعوت کو نظری بحث کی شکل میں پیش کرتے ہیں گویا ہم موجودہ ڈھانچے کو ہر سطح پر پوری طرح یکلخت بدل دینے کی بات کہتے ہیں جو دوسرے لفظوں میں "شرک فی الحاکمیت" کے نظرئیے کی اہمیت سمجھی جا سکتی ہے۔ دعوت کی عام قبولیت ہی انقلاب کی بنیاد ہے لیکن قبولیت کی کوئی ایسی صورت سمجھ میں نہیں آتی جو مسلمان کو سرگرم زندگی سے الگ کر کے گوشہ نشین بنا دے بلکہ ایک ایک کر کے پورا سماج تشکیل پا جائے اس صورت میں کہ پہلو بہ پہلو برعکس متوازی طاقات پائے جاتے رہیں اور ان سے تعارض کی نوبت بھی نہ آئے۔ اسی طرح پارلیمان

(بقیہ صفحہ ۳۴ پر)

تعارف و تبصرہ

افغان مجاہدین

مصنف سید اسعد گیلانی

سائز ۱۸×۲۳ صفحات ۲۳۶

کاغذ عمدہ کتابت شاندار آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت قیمت ۵۰ روپیہ

ملنے کا پتہ اسلامی اکادمی، منصورہ لاہور، پاکستان

سید اسعد گیلانی تصنیفات کی دنیا میں ایک معروف و مشہور نام ہے۔ وہ جن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ انشا پرداز اور صالح اور تعمیری ادب کے نقیب ہیں۔ آپ اپنی بات قاری کے ذہن میں ٹھونستے نہیں بلکہ دلیل و برہان اور مثالوں اور تشبیہات سے قاری کے ذہن کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور آپ اس میں کامیاب ہیں۔ آپ کی تحریروں میں سادگی، شگفتگی، سلاست و روانی نیز سنجیدگی متانت اور وقار پایا جاتا ہے۔ قاری جب کسی مضمون کو شروع کرتا ہے تو اسے ختم کئے بغیر نہیں رہتا۔ آپ اسلام کے داعی اور اسلامی انقلاب کے علمبردار ہیں۔ آپ ادیبوں کے اس ہراول دستہ سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے بحیثیت زدہ اشتراکی ادب کے مقابلے میں صالح ادب کو پروان چڑھانے کا بیڑہ اٹھایا اور انتہائی نامساعد اور بہت شکن حالات میں اپنے خون جگر کو جلا جلا کر اس شمع کو روشن کئے رکھا۔ بلکہ اشتراکی ادب پر چند بار ذہنے میں کامیاب ہوگئے۔ آپ کی زندگی دین، سیاست اور ادب کا حسین امتزاج ہے۔ آپ کی تازہ تصنیف "افغان مجاہدین" ہے۔ اس میں بڑی تفصیل سے آپ نے روس دوست خود سامراج کا تجزیہ کیا ہے اور مسئلہ افغانستان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ افغان کیمپوں کا بذات خود دورہ کیا ہے مہاجرین سے ملاقاتیں کی ہیں ان کے لیڈروں سے گفتگو کی ہے اور ان کے حالات و کوائف کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے ایک باب کی ذیلی سرخیاں کچھ یوں ہیں: افغان مجاہدین اور جہاد، افغان مجاہد کیمپ، مجاہد کی ڈائری مجاہد سے انٹرویو، مجاہد کا نعرہ، میدان جنگ میں، افغان مجاہدین کے کارنامے، روسی تیدیوں کے تاثرات افغان مجاہدین اور پاسبان، افغان مجاہد کی پکار، عالم اسلام کا جواب، افغان مجاہدین کا اتحاد —

لیں چوٹے بانکرد روسی سرخ سامراج کے ارادے اور افغان مجاہدین کے حوصلے اور عالم اسلام کے بارے میں جاننے کے لئے یہ کتاب بہت ہی مفید اور کارآمد ہے۔ ہر فرد لائبریری اور کتب خانہ میں اس کا رہنا ضروری ہے۔

ناموران علی گڑھ

سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ۔ کا خاص نمبر ناموران علی گڑھ پہلا کاروان۔ شمارہ جنوری تا ستمبر ۸۵

مدیر نورالحسن نقوی۔ معاونین محمد صابر، ریشما سہیل

سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۳۰۴ آفسٹ کی دیدہ زیب وخوبصورت طباعت

قیمت ۱۵ روپیہ، ملنے کا پتہ: ادارہ فکر و نظر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ یوپی

سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ سے شائع ہونے والا ایک معیاری ادبی اور تحقیقی رسالہ ہے۔ ناموران علی گڑھ کا یہ پہلا کاروان فکر و نظر کی تاریخ میں ایک سنگ میل ہے اور اس کے مدیر اور معاون مدیر نیز ادارہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ پہلا کاروان معمار قوم، سرسید، منشی مجم الدین، محسن الملک، سید مہدی علی خان، وقار الملک مولوی مشتاق حسین، علامہ شبلی، خواجہ الطاف حالی، شمس العلماء نذیر احمد، مولوی سمیع اللہ، جسٹس سید محمود، راجہ جے کشن داس، مولوی زین العابدین، مولوی ذکاء اللہ، مولوی چراغ علی، پرنسپل سر ٹامس واکر، آرنلڈ، پرنسپل ڈبلیو اے جے آرچبولڈ پر مشتمل ہے۔ یہ تمام مضامین علی گڑھ کی تاریخ بھی ہیں، تحقیقی مقالہ، ادبی مرقعے نیز سوانحی خاکے بھی، ہر فنکار کا فوٹو اس کا عکسی خط اور اس کے بعد اس پر سیر حاصل گفتگو، یہ اس خاص نمبر کی خصوصیت ہے۔ اس کا دوسرا کاروان زیر ترتیب ہے نیز تیسرا اور چوتھا کاروان تکمیل کے مراحل سے گذر رہے ہیں، یہ ایک تاریخی دستاویز ہے جو ہر لائبریری اور کتب خانہ کے لئے ضروری ہے، نیز جو لوگ بھی علی گڑھ اور اس کی تحریک سے محبت رکھتے ہیں اور ناموران علی گڑھ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں اس شمارے کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

الحسنات (اسلامی اردو ڈائجسٹ) بابری مسجد نمبر

ایڈیٹر عبدالملک سلیم شمارہ اگست ۱۹۸۶ء

صفحات ۲۲۸ آفسٹ کی عمدہ طباعت، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت ۱۲ روپیہ

ملنے کا پتہ: ادارہ الحسنات رامپور، یوپی ۲۴۴۹۰۱

ادارہ الحسنات ایک معروف ادارہ ہے جس نے کئی ایک بیش بہا کتابوں کو شائع کیا ہے اور جسے ایک طویل مدت سے دین کی خدمت کی ہے اور کر رہا ہے۔ اس ادارے کے کئی رسالے شائع ہوتے ہیں، ہلال، نور، حجاب اور الحسنات۔ الحسنات ان رسالوں میں سب سے معیاری اور عمدہ ہے۔ اس کا موجودہ شمارہ بابری مسجد پر خاص نمبر ہے۔ اجودھیا میں واقع یہ مسجد طاقتور کا کمزور پر ظلم و زیادتی کی واضح مثال اور تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ ۵۰۰ سو سال تک غیر متنازعہ اور خدائے واحد کی سجدہ گاہ کا شرف اسے حاصل رہا ہے۔ مگر ۱۹۴۹ سے اس کو متنازعہ بنادیا گیا اور فروری ۱۹۸۶ء میں اس پر زبردستی قبضہ کرلیا گیا اس وقت سے لے کر آج تک اس پر ہزاروں صفحات لکھے گئے ہیں اور سیکڑوں جانیں قربان کی گئی ہیں، مظاہرے کیے گئے، کالی پٹیاں باندھی گئی اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا اضطراب اور بڑھتا ہی جارہا ہے۔ الحسنات کا یہ خاص نمبر اپنے دامن میں بابری مسجد کی پوری تاریخ سمیٹے ہوئے ہیں۔ تحقیقی مضامین، تاثراتی تحریریں، انٹرویوز، نظمیں اور غزلیں اس شمارہ کی جان ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بارہ بنکی میں نہتے مسلمانوں پر پی اے سی اور پولیس کی تشدد بازی اور خون کی ہولی کا ایک خونچکاں البم ہے۔ جس نے بارہ بنکی کے حادثہ کو زندہ جاوید بنادیا ہے۔ بابری مسجد کی تاریخ کو جاننے کے لیے اس خاص نمبر کا پڑھنا بہت ضروری ہے۔ اس سے ایک حد تک تشفی ہو جائے گی۔ خدا ان تمام لوگوں کو جزائے خیر سے نوازے جنھوں نے اس کے نکالنے میں تعاون کیا ہے۔

قارئین سے گذارش

حیات نو کے دامن کو اور وسیع کر دیا گیا ہے۔ اب ۵۶ صفحات کے بجائے ۶۴ صفحات شائع ہوگا اور قیمت تھوڑی بڑھادی گئی ہے۔ سالانہ ۳۰ روپیہ اور فی کاپی ۳ روپئے۔

قارئین نوٹ کرلیں۔